

امرتا پریتم

لاہور بک شاپ۔ لاہور

چھبیس سال بعد

اور دوسرے افسانے

امرتا پریتم

ناشر
لاہور بک شاپ



لاہور بک شاپ نسبت روڈ لاہور

اِنتساب

اُس کے نام ———

جو میری زندگی کی حقیقت بنا

(امرتا)

فہرست

شکریہ

برادرم شمشیر سنگھ صاحب خنجر کی میں ممنون ہوں جنہوں نے میری کہانیوں کو اردو لباس پہنایا۔

امرتا پریتم

تعارف

امرتا پریتم پنجابی زبان کی شاعرہ ہے۔ اُس کی شاعری کی شہرت کا حلقہ بھی اتنا ہی وسیع ہے جتنا خود پنجابی زبان کا۔ یہ حلقہ اور بھی زیادہ وسیع ہوتا، بشرطیکہ پنجابی اور اُردو کے باہمی تعلقات زیادہ خوشگوار ہوتے۔ جب تک ان دونوں زبانوں کے تعلقات اچھے نہیں ہیں، اُس وقت تک ایک زبان کے شاعر کو دوسری زبان کے حلقے میں وہ مقبولیت حاصل نہیں ہو سکتی جس کا وہ مستحق ہے۔ توقع رکھنی چاہئے کہ جوں جوں حجاب اُٹھتے جائیں گے، ایک دوسرے کا تعارف آسان ہوتا جائے گا۔

یہ درست ہے کہ کبھی کبھی امرتا کی شاعری کی جھلک اُردو صحافت کے

محاسن پر بھی نمودار ہو جاتی ہے۔ لیکن شاعری بہرحال شاعری ہے۔ اسے دوسری زبان کے الفاظ میں منتقل کرنا اول تو بجائے خود بہت مشکل ہے۔ لیکن اگر یہ ممکن بھی ہو تو زیادہ سے زیادہ یوں کہیں گے کہ ایک زبان کے لفظ دوسری زبان کے لفظوں میں منتقل ہو گئے ہیں ——— اصل چیز مفہوم ہے، اور مفہوم کو ایک زبان سے دوسری زبان میں اس طرح منتقل کر دینا کہ شاعر کے سارے محسوسات ادا ہو جائیں، در حقیقت ناممکن ہے۔ اس امر واقعہ کی موجودگی میں اگر اُردو اور پنجابی کے باہمی تعلقات اچھے بھی ہو جائیں، تو بھی یہ محال ہے کہ امرتا کی شاعری کے سارے محاسن، اہلِ اُردو کے سامنے بے نقاب کئے جا سکیں۔

لیکن یہ مشکل صرف نظم تک ہی محدود ہے۔ نثر اس گرفت سے کامل طور پر نہیں تو بہت حد تک، بہرحال آزاد ہے۔ ایک زبان کا ادیب اپنے نثری کمالات کو دوسری زبان میں بھی پیش کر سکتا ہے۔ صرف محنت اور سلیقے کی ضرورت ہے یا ان معمولی وسائل کی، جن کا حصول مشکل نہیں ہے۔

امرتا کے متعلق بہت کم اُردو دانوں کو یہ معلوم ہوگا کہ وہ صرف شاعرہ ہی نہیں، بلکہ پنجابی زبان کی ایک مسلّمہ ادیب اور افسانہ نگار بھی ہے۔ آئندہ اوراق میں اس کے افسانوں کا ایک مجموعہ پیش کیا جا رہا ہے۔ اُوپر کے حقائق کے پیشِ نظر، اگر اس کی شاعری اُردو میں منتقل نہیں ہو سکتی، تو مقامِ مسرت ہے کہ یہ افسانے اس ناگزیر مجبوری کی تلافی کریں گے۔

ہر زمانے کا ادب اپنے وقت کے ذہنی، اخلاقی، معاشی اور سیاسی رجحانات سے متاثر ہوتا ہے۔ وقت ایک سمندر ہے، اخلاقی اور سماجی قدریں اس سمندر کی لہریں ہیں۔ بہت کم ادیب ایسے ہوں گے، جو اپنی کشتی کا ایک خود مختار رخ مقرر کر سکیں۔ وہ اپنے آپ کو ان لہروں کے سپرد کر دیتے ہیں، در حقیقت ایسا نہیں ہونا چاہیئے۔ ادیب لہروں کے بہاؤ پر بہنے والے حقیر تنکے نہیں ہیں۔ لہروں کو پاش پاش کر کے، اپنے قافلے کی راہنمائی کرنے والے حوصلہ مند ملاّح ہیں ——— افسوس ہے، بہت کم ادیبوں نے اپنی قوت اور اپنے فرض کا اندازہ لگایا ہے۔ بے شمار لکھنے والے اپنی راہ سے بھٹک جاتے ہیں۔ وہ عوام کی رہبری نہیں کرتے، ان کی پیروی کرتے ہیں۔ سچا ادیب عوامی جذبات کا پیرو نہیں بن سکتا، راہنما ہی بنے گا۔

موجودہ وقت، ادیبوں اور افسانہ نگاروں کے لئے ایک نازک وقت ہے۔ عوام کے مطالبے بہت پست ہیں۔ اخلاقی قدریں بہت گر گئی ہیں۔ "ترقی پسند ادب" نے جسے تنزل پسند ادب کا نام دینا زیادہ مناسب ہے۔ ان کا مذاق بگاڑ دیا ہے۔ تیسرے درجے کی فلموں، عریاں افسانوں اور ناولوں نے اُن میں نہایت گھٹیا قسم کے شوق پیدا کئے ہیں۔ نام نہاد افسانہ نگاروں اور ادیبوں کا ایک طبقہ عوام کی اس ذہنیت سے فائدہ اُٹھا کر ادنےٰ درجے کا لٹریچر پیدا کر رہا ہے۔ انہوں نے اپنی ذمہ داریوں سے مجرمانہ بے پروائی اختیار کر رکھی ہے۔

جون پورٹڈ (JONE PARTED) کا قول ہے: "کسی ملک کی شان وعظمت بقول جانسن اس ملک کے مصنفوں کی بدولت ہوتی ہے، لیکن یہ اسی وقت جب مصنفین پیغمبرِ خرد ہوں۔ اگر اُن سے اخلاقِ حسنہ کے سبق نہ ملیں، تو ان کے گلے میں ہار کے بجائے طوقِ لعنت ہونا چاہئے۔" اس حقیقت کا اعتراف کتنا تکلیف دہ ہے کہ ہمارے "ترقی پسند" مصنفوں کی نئی کھیپ آنے والی نسلوں کے نزدیک "طوقِ لعنت" ہی کی مستحق ہوگی۔

اس مایوس کن فضا میں اگر کوئی ادیب یا شاعر اپنی حقیقی ذمہ داریوں کا احساس رکھتا ہے، اور عوام کے پیچھے چلنے کے بجائے اُن کی پیشوائی کو اپنا حق سمجھتا ہے۔ تو بلاشبہ وہ غیر معمولی عزت وتوقیر کا مستحق ہے۔ اس نقطۂ نگاہ سے جب ہم امرتہ کی شاعری اور اس کے افسانوں کا جائزہ لیتے ہیں، تو لازماً اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ اُسے اپنے شاعرانہ اور ادبی فرائض کا گہرا احساس ہے۔ وہ اپنے ہمعصر شاعروں اور ادیبوں کی "ترقی پسندانہ" روش سے بالکل متاثر نہیں ہوئی، اُس کے افسانے، اس کی نظموں کی طرح بہترین اخلاقی قدروں سے مالامال ہیں۔ ایک بھی افسانہ ایسا نہیں ہے، جس پر حیاء واخلاق کے نقطۂ نظر سے کوئی حرف رکھا جاسکے۔

اُس کے افسانوں میں، افسانے کے سارے عناصر موجود ہیں، اُس کے کردار عام انسانی کردار ہیں، اگرچہ وہ افسانہ نگاری کی شہرت کی مالک نہیں، لیکن ان افسانو کا ایک سرسری جائزہ بھی، اس نتیجے پر پہنچا دے گا کہ امرتہ افسانہ نگاری کے سارے

اوصاف سے بہرہ مند ہے۔ وہ مطالعہ کرسکتی ہے، سوچ سکتی ہے، اور قابلیت اور فن کاری کے ساتھ اپنے مطلب کو عمدہ پیرائے میں بیان کرسکتی ہے۔ وہ صرف واقعات کے عینی مشاہدے پر اکتفا نہیں کرتی بلکہ اپنے افسانے کے ہر کردار کا نفسیاتی جائزہ بھی لیتی ہے۔ انسانی زندگی کا "جذباتی مطالعہ" بھی اُس کے ہر افسانے میں نمایاں ہے۔

وہ اپنے افسانوں کے لئے نئے نئے موضوع "تلاش کرتی ہے۔ اور اپنی اس کوشش میں وہ بہت حد تک کامیاب ثابت ہوتی ہے۔ اُس کے خیال اچھوتے ہیں، اُس کی راہیں جدید ہیں، اُس کا "آئیڈیل" تخریبی نہیں، تعمیری ہے۔ نظم کی طرح وہ افسانوں میں بھی اپنے پڑھنے والوں کو "پیغام" دیتی ہوئی نظر آتی ہے۔ اُس کا پیغام زندگی اور محبت کا پیغام ہے۔

اُس کے افسانے صحیح معنوں میں مختصر افسانے ہیں۔ بعض افسانے شعروں کی طرح ضرورت سے زیادہ مختصر بھی معلوم ہوتے ہیں۔ پڑھنے والے کا جی چاہتا ہے کہ وہ قدرے اور مفصّل ہوتے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اگر وہ اتنے مختصر نہ ہوں، تو امرتہ کے قلم میں اتنی قوت موجود ہے کہ وہ اپنے اجمال کو تفصیل کا رنگ دے کر اُن کی جاذبیت بھی بڑھا سکے۔ لیکن یہ محض "تعارف نویس" کا ذوقی مطالبہ ہے، ضروری نہیں ہے کہ ہر پڑھنے والا اس کے خیال سے پوری طرح متفق ہو۔

یقین ہے کہ افسانوں کا یہ مجموعہ اردو ادب میں نمایاں جگہ حاصل کرے گا۔

شمشیر سنگھ نخجر

گیلانی پریس [illegible] بک شاپ نسبت روڈ لاہور سے شائع ہوئی

چھبیس سال بعد

"کہانی — کہانی انسانی زندگی میں یوں خلط ملط ہو گئی ہے۔ جیسے نان و نمک۔ کہانی، پہیلیوں، جن بھوتوں اور اِدھر اُدھر کی کہانیوں سے [illegible] کے گیت

یہ دل و دماغ دنیا سب بن گئے کہانی

کے مصداق انسان کی خود اپنی کہانی تک یہ کہانی وسعت پذیر ہے۔

آج تک میں تمہیں بچپن کی چڑیا توتے کی کہانی سے لیکر ساری دنیا کی کہانی سناتا رہا ہوں۔ لیکن آج تمہاری شب عروسی کے موقعہ پر میں سمجھتا ہوں کہ وہ وقت آ پہنچا ہے جب میں تمہیں اپنی زندگی کی سب سے اہم کہانی بھی سُنا دوں۔" مادھو نے ایک گرم کمرے میں بیٹھے ہونے کے

باوجود کمبل کو اپنے جسم کے گرد اور بھی اچھی طرح لپیٹتے ہوئے کہا۔

"باپ بیٹے کے درمیان بھی کبھی وہ وقت آجاتا ہے، جب عمر اور بزرگی کی تفاوت بھی کوئی تفاوت نہیں رہتی، بیٹے کا شباب باپ بیٹے کے رشتے کے فاصلے کو دوستی کے پل سے پاٹ کر انہیں ایک دوسرے کے نہایت قریب لے آتا ہے۔"

کمار مادھو کے اور نزدیک ہو بیٹھا۔ اور مادھو نے سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا: "پانی کے گرنے کی آواز ساری کی ساری کھڈ کو سنگیت سے کیوں لبالب بھر دیتی ہے، بارش کی بوندیں جب پتوں پر پڑتی ہیں۔ تو رم جھم کی آواز ساری فضا میں کیوں پھیل جاتی ہے۔ اور بادرواں تو بغیر کسی شے سے ٹکرانے کے سائیں سائیں کی ایک لہر سی پیدا کر دیتی ہے۔ اس لئے میرے بچے! تم مجھے یہ نہیں پوچھ سکتے کہ میں نے اپنی شادی ہو جانے کے بعد بھی ایک دوشیزہ سے محبت کیوں کی۔ بس یوں سمجھ لو کہ جس طرح پانی کو گرنا ہی تھا۔ اور ایک ترنم پیدا ہونا ہی تھا۔ اسی طرح مجھے اُس کو دیکھنا ہی تھا۔ اور اس سے محبت کا رشتہ باندھنا ہی تھا۔ قدرت کے کئی واقعات سمجھ میں نہیں آتے۔ میرے بچے! وہ اس وقت کسی درسگاہ میں پڑھا کرتی تھی اور پڑھتی ہی رہی۔ اس کا نام ممتا تھا۔ زندگی کے ایک موڑ پہ ہم آپس میں ملے تھے۔ اور دُوسرا موڑ ہمیں ایک دوسرے

سے جُدا کرنے کے لئے قریب تر آرہا تھا —— بس ایک ہی راہ تھی ہمارے ملنے کی۔ یعنی میں اُس سے شادی کر لیتا —— لیکن اُس نے نہ مانا۔ کیونکہ ایسا کرنے سے میری پہلی بیوی —— تمہاری ماں کے ساتھ نہایت ناانصافی ہوتی تھی۔ وہ کبھی کبھی ہمارے ہاں آیا کرتی تھی۔ اور تمہاری ماں کو بغل میں لئے وہ گھنٹوں یوں بیٹھی رہتی تھی گویا وہ اُس کی آغوش میں شاید کسی دن گم ہو کر اُس کے ساتھ یکجان ہو جائے گی —— لیکن یہ نہ ہونا تھا اور نہ ہوا میرے کمار!" مادھو کے ہاتھ ٹھنڈے ہونے لگے۔ وہ اُنہیں کمبل کے اندر بھی دبا دبا کے گرم کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ لیکن جہاں سے اُس کی یہ سردی پیدا ہو رہی تھی، وہاں کسی کمبل کی گرمائی کارگر نہیں ہو سکتی تھی۔

"کمار میرے بچے! وہ نہایت خوش تھی۔ اور نہایت رنجیدہ تھی۔ وہ کہا کرتی تھی۔ دُور چمکتے ہوئے تارے کی طرح دُنیا میں صرف آپ کی موجودگی ہی میرے لئے کافی ہے۔ لیکن اُس کا یہ کہنا صرف اُس کے دماغ کا کہنا تھا۔ ضبط کے غمکدہ میں رہنا کوئی آسان بات نہیں تھی۔ جس کے اندر وہ ہمیشہ رہی۔ اور اس حالت میں جذبات کے کس قدر کانٹوں نے اُس کے نازک دل کو زخمی کیا ہوگا۔ اس کا اندازہ بھی کرنا آسان نہیں۔ جہاں تک دل کا تعلق تھا ہماری شادی ہو چکی تھی۔ لیکن ......" مادھو کے ہاتھ کانپنے لگے، اور

آواز میں لرزش آگئی۔ وہ لمحہ بھر خاموش رہ کے سنبھل کر بولا۔

"ممتا کہا کرتی تھی، کھیل کھیل ہی ہوتا ہے —— اگر چھوٹے چھوٹے بچے کھیل میں تھوڑا اکٹے نہیں روتے تو ہم اتنے بڑے ہو کر اس کھیل میں کیوں رونے لگیں؟ ..... ایک دن تمہاری ماں نے ممتا کو گھر میں رکھی تمام تصویریں دکھائیں جن میں بیشتر میری تھیں۔ ممتا نے جھجکتے جھجکتے میری ایک تصویر تمہاری ماں سے مانگ لی۔ تمہاری ماں نے اُس کی طرف یوں دیکھا جیسے اُس کی آنکھیں کہہ رہی ہوں —— میرے شوہر کی تصویر —— بھلا تم کیوں اسے مانگتی ہو؟ اور ممتا کی آنکھوں میں کچھ اس قسم کا جواب تھا: تمہارے پاس بہت کچھ ہے، میری بہن! میں اس تصویر سے زیادہ کچھ نہیں مانگتی۔ بس یہی ..... تمہاری ماں نے بغیر کچھ کہے وہ تصویر ممتا کے ہاتھوں میں دیدی۔ اور ممتا کو یوں محسوس ہوا گویا اس دن سے میرے ساتھ نہیں —— بلکہ تصویر سے باتیں کر سکنے کا اور دل کھول کے رکھ سکنے کا حق اُس نے تمہاری ماں سے مانگ کے لے لیا ہے۔ ممتا نے کہیں بھی شادی کرنے کا خیال ترک کر دیا۔ اور مزید تعلیم حاصل کرنے کی غرض سے اس شہر کو چھوڑ کر چلی گئی۔" مادھو نے ذرا رک کے کمار کی طرف دیکھا ..... کمار کے چہرے پر غم کے سوا اور کچھ نہ تھا۔ مادھو پھر کہنے لگا۔

"منزل کے پڑاؤ کی طرح، ہم پھر ایک مرتبہ ایک دوسرے سے ملے۔

اُس وقت تمہاری عمر ڈیڑھ سال کے قریب تھی۔ کسی دوست کی شادی کی تقریب پر یہ اتفاقیہ ملاقات ہوئی تھی۔ گرد و پیش کی سینکڑوں آنکھوں کے درمیان ہم نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ میں نے چپ چاپ جا کے تمہیں ممتا کی گود میں دیدیا۔ میرے آنسو بھر آئے۔ ممتا نے تمہیں اپنی چھاتی سے لگا لیا ..... تمہیں —— میرے بچے کو —— بس اس سے زیادہ وہ مجھ سے مل بھی کیسے سکتی تھی .....؟" مادھو نے دائیں ہاتھ سے اپنی پیشانی کو ذرا دبایا۔ اور پھر کہنے لگا۔

"میرے پاس تم تھے، تمہاری ماں تھی اور ممتا کی یاد تھی ..... لیکن اس غریب کے پاس کتابوں کے خشک مطالعہ اور میری رنجیدہ یاد کے سوا اور کیا رکھا تھا؟ ..... میں نے ممتا سے کہا کہ وہ کہیں شادی کر لے۔ لیکن وہ کہنے لگی کہ دل کے ایک مرتبہ ٹوٹ چکے ٹکڑوں کو اب وہ جوڑ نہ سکے گی ..... کھیل کھیل ہی ہوتا ہے، اگر چھوٹے چھوٹے بچے کھیل میں تھوڑا کٹے روتے نہیں، تو ہم اتنے بڑے ہو کے اس کھیل میں کیوں رونے لگیں؟ میں نے اُس کے یہ الفاظ اُس کے روبرو دُہرائے، اور کہا، اگر ہم اپنی زندگی میں ایک دوسرے سے ملنے سے مجبور اور معذور رہے ہیں۔ تو شاید ہم اپنے بچوں کی زندگی میں ایک دوسرے سے مل جائیں۔ صدیوں سے بھٹکتی ہوئی دو روحوں کو مل لینے دو۔ ممتا! میرا دوسرا روپ میرا بچہ کمار ہے۔ تم اپنا آپ کسی ننھی منھی

بچی میں تبدیل کر لو۔ اور تڑپتی ہوئی ان دو روحوں کو آپس میں مل سکنے کا ایک بار پھر موقع دو۔۔۔۔۔۔ ایک بہانہ بناؤ ۔۔۔" میں نے روتے ہوئے ممتا سے کہا۔۔۔۔ ممتا نے سچ مچ جہاں اُس کے والدین نے کہا چُپ چاپ شادی کرالی۔ اور ایک حسین لڑکی کا بُت وجود میں لانا، اُس نے اپنی زندگی کا مقصد بنا لیا۔۔۔۔۔ اُس نے اپنے اوصاف، اپنا علم، اپنی فنکل، اپنا حسن، اپنا دل، اپنا دماغ، غرضکہ اپنی تمامتر زندگی اس لڑکی کے اندر حلول کر دی"۔

مادھو نے کمار کی طرف دیکھا اور کمار نے تڑپ کر پُوچھا۔" اور وہ کہاں ہے؟"

مادھو مسکرا دیا:" پھر ہم نے تم دونوں کی منزل کے لئے خود راہیں بنائیں تم دونوں کو اکٹھی تعلیم دلائی۔ میرا مطلب ہے، جہاں تم پڑھتے تھے وہیں اسے بھی داخل کرا دیا ۔۔۔ ان کھلونوں میں ہم کافی تسلی تلاش کر لیتے تھے۔ اور ہم دونوں کو یقین تھا کہ ہمارے بچوں میں ہماری بھٹکتی ہوئی روحیں ضرور ایک دوسرے کو تلاش کر لیں گی ۔۔۔ اور کمار، ہماری محنت کا ثمر جیس دن مل گیا، جب تم نے مجھے آکے کہا:" پتا جی مجھے کچھ آپ سے کہنا ہے ۔۔۔۔" مادھو نے مسکرا کے کمار کی طرف دیکھا۔ کمار کا سانس اکھڑا اکھڑا معلوم ہوتا تھا:" مجھے معلوم تھا میرے بچے! تم نے مجھے جو کچھ کہنا تھا۔ لیکن پھر بھی میں نے کہا:" کہو کیا کہتے ہو؟" تم نے پوچھا:" میری ایک بات مانیں گے؟

میرے نونہال، تمہاری اسی ایک بات کے لئے تو میں زندگی بھر تڑپتا رہا ہوں بھلا میں انکار کیسے کرتا۔ پھر بھی میں نے کہا:" اگر ماننے کے قابل ہوئی تو۔۔ ۔۔۔۔ تمہارا چہرہ زرد ہو گیا۔ میں نے نہایت محبت اور رحم بھری نظروں سے تمہاری طرف دیکھا۔ میں جانتا تھا تمہارے اندر میری اپنی ہی رُوح تڑپ رہی ہے ۔۔۔ تم نے گھبرا کے کہا:" پتا جی، رانی ۔۔۔۔۔" اور تم اس سے آگے کچھ نہ کہہ سکے۔ میری آنکھوں میں خوشی کے آنسو بھر آئے۔ آج میری زندگی بھر کی امید بر آئی تھی"۔

کمار کی آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا آئے۔ اور اُس کا سر کسی عقیدت کے زیر اثر باپ کے آگے جُھک گیا۔ مادھو نے اپنی آنکھیں بند کر لیں اور آہستہ سے کہا

آج تمہاری اور رانی کی شب عُروسی ہے۔ میری اور ممتا کی بھٹکتی ہوئی روح آج چھبیس سال کے بعد۔۔۔۔۔۔"

مادھو اس سے آگے کچھ نہ کہہ سکا۔

"اچھا تو آپ کو تکلیف کیا ہے؟" ماما جی کہتے تھے ... پوری طرح نیند ......"

"ڈاکٹر کو دکھانے آیا ہوں .... جو وہ بتائے گا۔"

"تو گویا ابھی دکھانا ہے۔ کون سے ڈاکٹر کو؟ اسی طرف رہتا ہے آپ کا ڈاکٹر؟"

اور روی کے جواب دینے سے پہلے شیلا پھر کہنے لگی: "میں بھی تو یہی سوچ رہی تھی کہ آپ آج کیونکر گئے ___ آئے ہیں ڈاکٹر سے مشورہ لینے، اور راستے میں پڑتا ہے ہمارا گھر ___ خیر یونہی سہی۔ آخر آپ آ تو گئے۔" روی یہ سن کر مسکرا دیا۔

"چائے پئیں گے آپ؟"

"چائے؟" روی نے شیلا کی طرف دیکھا۔

"ہاں چائے۔"

"چائے ..." اور روی کمرے کی تصویریں دیکھنے لگا۔ شیلا حیران تھی کہ اتنے باتونی روی کو آخر ہو کیا گیا ہے۔ وہ بیمار ہے، اور پھر اسے نیند بھی تو نہیں آتی۔

شیلا کو یاد آیا چائے منگا لی گئی۔ چائے پیتے ہوئے شیلا سوچنے لگی کہ امتحان میں سوالات کا پرچہ تو ایک ہوتا ہے۔ لیکن جواب لکھنے میں کاپیاں ختم ہو جاتی ہیں۔ لیکن یہاں تو شیلا کے سوالوں کی بھرمار سے صفحوں پر صفحے ختم ہوتے جاتے تھے، اور روی کے مختصر جوابوں سے بمشکل ایک صفحہ بھی .....

× × × × × × ×

ڈاکٹر نے کہا ہے

"اجی آپ؟" اور شیلا کرسی سے اٹھ بیٹھی۔ روی کمرے کے اندر داخل ہوا۔ سفید کھادی کا چست پاجامہ، سفید کھادی کی قمیص اور سفید ہی اونی شال اوڑھے ہوئے۔ سر کے خشک بال منتشر اور بکھرے ہوئے تھے۔ اس کا بایاں ہاتھ شال کے اندر سینے پر رکھا تھا۔

"مجھے معلوم ہوا تھا آپ کی طبیعت ناساز ہے میں آنے ہی کو تھی۔ آج تو مجھے ضرور آنا تھا ___ آپ خود ہی چلے آئے ....." شیلا نے روی کو صوفے پر بٹھا لیا۔ روی نے شیلا کی طرف اس انداز سے دیکھا، گویا اس کی آنکھیں کہہ رہی تھیں

"کوئی مضائقہ نہیں آخر مریض ہی ڈاکٹر کے پاس آیا کرتے ہیں۔"

"شیلی!" روی نے دروازے کی طرف نگاہ اٹھائی۔

"ہاں! آپ کی خیریت دریافت کرنے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اور شیلا کمرے کے اندر چلی آئی۔

"بیٹھئے۔"

"اب کیا حال ہے؟"

"اچھا ہے۔"

"ڈاکٹر کو دکھایا تھا؟"

روی نے شیلا کے چہرے پر نظر ڈالی۔

"کیا کہا ہے ڈاکٹر نے؟"

"کچھ بھی نہیں کہا۔"

"ڈاکٹر نے کچھ کہا ہی نہیں؟" شیلا ہنسنے لگی۔

"سچ کہتا ہوں کچھ نہیں کہا ڈاکٹر نے۔"

"لیکن دیکھا بھی تھا اُس نے؟"

"ہاں دیکھا تو تھا۔" روی نے شیلا کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے جواب دیا۔

"پھر آپ نے بھی کچھ نہیں پوچھا؟"

"پوچھنے کا ڈھنگ نہیں آتا۔"

شیلا کو یاد آ گیا روی کی ماتاجی کہہ رہے تھے کہ روی ان دنوں بہکی بہکی باتیں

کرتا ہے۔ شاید پوری طرح نیند نہ آنے کی وجہ سے ۔ ۔ ۔ شیلا خاموش ہو گئی۔

"چائے پلائیے۔" روی نے اپنی مہمان شیلا سے کہا۔

"معلوم ہوتا ہے آپ کو بہت اچھی لگتی ہے۔" شیلا نے مُسکراتے ہوئے کہا۔ "لیکن میں نے تو اُس دن بھی غلطی کی تھی۔ ماتاجی نے آپ کو چائے نہ دینے کی ہدایت کر رکھی ہے۔ کیونکہ آپ کو پورے طور نیند ۔ ۔ ۔ ۔ نیند کے لئے چائے مضر ہوتی ہے۔" شیلا نے بزرگانہ انداز سے کہا۔ اور روی اُس بچے کی طرح ہنسنے لگا جو کبھی کبھی کسی بزرگ کی پند و نصائح سُن کر ہنس دیتا ہے۔

"لیکن پھر بھی کچھ تو افاقہ معلوم ہوتا ہوگا؟" شیلا کو اور کوئی بات نہ سوجھی۔

"ہاں پہلے کی بہ نسبت افاقہ ہے؟"

"کل سے تو اچھے معلوم ہو رہے ہیں آپ" و شیلا پھر ہنسنے لگی۔

کہیں ریکارڈ بج رہا تھا۔ ع

اس طرح مسکرا کے نہ دیکھو تمنا کہیں جواں نہ ہو جائے

× × × × × ×

شیلا آتی رہی ۔ ۔ ۔ ۔ بیمار پُرسی کرتی رہی، اور ماتاجی کہتے رہے۔ جوں جوں دوا کرتے ہیں لڑکا دن بدن اندر ہی اندر گھُلتا جا رہا ہے ——

"مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی"

لیکن روی کہتا رہا۔ "پہلے کی بہ نسبت افاقہ ہے۔"

"اچھا! صحت یاب کب ہونگے آپ؟" گویا شیلا کا جی چاہتا تھا اُسے ایک منٹ کے اندر تندرست کر دے۔

"یہ ڈاکٹر کو معلوم ہوگا۔"

"لیکن کیا کہتا ہے ڈاکٹر؟"

"کہتا کچھ بھی نہیں —— لیکن جس وقت سامنے ہو، مجھے یوں محسوس ہوتا ہے گویا میں صحت یاب ہو گیا ہوں۔ ڈاکٹر کے جانے کی دیر ہوتی ہے کہ مرض پھر اُسی طرح عود کر آتا ہے۔" روی اتنا کچھ کہہ گیا۔

"ہاں! یوں ہُوا ہی کرتا ہے۔ بھیا کو ٹائیفائیڈ ہُوا تھا تو ہم بہت گھبرا گئے تھے —— جب بھی ڈاکٹر دیکھنے کو آتا، ہم سمجھنے لگتے کہ بھیا درحقیقت اچھے ہو رہے ہیں۔ لیکن ڈاکٹر کے جانے کے بعد ہمیں بھی یوں محسوس ہونے لگتا کہ اچھا ہونے کی بجائے بھیا کی صحت روز بروز گرتی جا رہی ہے۔ ڈاکٹروں کی باتوں میں تسلی ہوتی ہے۔"

"لیکن مجھے تو میرے ڈاکٹر نے کبھی تسلی نہیں دی۔"

"نہیں ڈاکٹر کے دیکھنے میں تسلی ہوتی ہے۔"

"ہاں دیکھنے میں بھی ہوتی تو ہے۔" روی نے شیلا کی طرف اچٹتی نگاہ سے دیکھتے ہوئے کہا۔ اور پھر ہنسنے لگا۔ شیلا نے سوچا کس قدر حوصلہ ہے۔ بیماری میں بھی روی ہنس سکتا ہے۔

اور اسی طرح شیلا آتی رہی، بیمار پُرسی کرتی رہی اور روی ہمیشہ کہتا رہا۔ "اس وقت اچھا ہوں۔ پہلے سے اچھا ہوں۔" شیلا کتنے دن آتی رہی —— روی چائے مانگتا، شیلا کہہ دیتی۔ "ماتا جی نے کہہ رکھا ہے، آپ کے لئے چائے ٹھیک نہیں، ابھی آپ کو نیند بھی تو . . . ." روی ہنس دیتا۔ اور پھر شیلا بھی ہنسنے لگتی —— لیکن آج شیلا نے ذرا ترش ہو کے کہا۔

"ڈاکٹر نے کیا مذاق بنا رکھا ہے —— افاقہ تو کچھ ہوتا نہیں۔"

"مریض کا اس میں کیا قصور؟"

"لیکن جب سے آپ کیسے جا رہے ہیں؟" "پہلے کی بہ نسبت آرام ہے" "اُس وقت سے تھوڑا تھوڑا افاقہ بھی ہُوا ہوتا، تو آپ کب کے صحت یاب ہو چلے ہوتے۔"

"بات دراصل یہ ہے کہ ڈاکٹر کہتا ہے دوائی دیرپا اثر نہیں کرتی۔ جب خوراک پیتا ہوں آرام معلوم ہوتا ہے۔" روی نے شیلا کی طرف پیاسی نظروں سے دیکھا۔ اُس کی آنکھیں کچھ پینے کی متمنی معلوم ہوتی تھیں۔

"تو آپ ڈاکٹر کیوں نہیں بدل لیتے؟"

روی نے اُس کی طرف دیکھا، پھر نگاہ نیچی کر لی۔ چند ثانیے خاموش رہنے کے بعد اُس نے جواب دیا

"شیل: میں اُن مریضوں میں سے نہیں ہوں جو......"

"لیکن اگر بیماری ایک ڈاکٹر کی سمجھ میں نہ آئے تو ہو سکتا ہے، کوئی دوسرا ڈاکٹر......"

"اگر بیماری سمجھ میں نہ آئے تو میری قسمت کا اور ڈاکٹر کی سمجھ کا قصور ہے۔" روی پھر ہنسنے لگا۔ لیکن ایسی ہنسی جیسی مایوس مریض کسی کے سوال کرنے پر "اب تو پہلے سے اچھے ہونا" ہنسا کرتے ہیں۔

"اچھا تو کل ڈاکٹر سے پوری تفصیل کے ساتھ دریافت کریں۔ اور پھر مجھے بتائیں کہ وہ کیا کہتا ہے۔" شیلا رخصت ہو گئی۔

اس کے بعد شیلا کئی دن تک نہ آئی۔ آخر روی نے اپنی ماتا جی سے پوچھا: "شیل کبھی آتی نہیں؟"

انہوں نے جواب دیا: "شیل کی منگنی ہونے والی تھی۔ کل شگون دیا جانا تھا۔ آ نہیں سکی اتنے دن۔ اب اُسے فرصت مل ہو گی۔ کہہ رہی تھی آؤں گی ایک دن۔"

روی خاموش رہا۔ اس نے اپنے بائیں ہاتھ کو جو پہلے ہی سینے پر رکھا تھا ذرا دبایا، اور اندر ہی اندر آہ بھرتے ہوئے کہنے لگا: "اور اُس نے مجھے اپنی منگنی کی اطلاع تک نہ دی۔"

"بیٹا تم بیمار جو تھے" ماں نے محبت بھرے لہجے میں جواب دیا۔

پھر وہ اپنے کمرے میں چلا آیا۔

× × × × ×

"نمستے شیلا!"

"ارے...... آپ؟...... میں بہت شرمندہ ہوں ——— اتنے دن آ نہ سکی" شیلا کے ہاتھ میں چائے کی پیالی تھی۔ اور اس وقت کتنا محبوب معلوم ہوتا اگر وہ روی کو چائے پیش نہ کرتی ——— چاہے ماتا جی نے کہہ رکھا تھا کہ روی کے لئے چائے مضر ہے۔

"تھوڑی سی چائے......" شیلا نے پیالی آگے کرتے ہوئے کہا۔

"مریض کے لئے چائے نقصان دہ ہوتی ہے" روی نے شال کے اندر ہی اندر اپنے بائیں ہاتھ کو سینے پر آہستہ سے دباتے ہوئے جواب دیا۔

"بیٹھیں گے نہیں کیا؟"

"مبارکباد دینے آیا تھا" ہاتھ اور بھی زور سے دبنے لگا۔ شیلا نے اپنی نظریں زمین پر گاڑ دیں۔ وہ سوچ رہی تھی "روی کہتا ہوگا میں اس قدر بیمار ہوں، اور اسے اپنے بیاہ شادی کی سوجھ رہی ہے۔"

"شیلا! تم نے کہا تھا ڈاکٹر سے پوچھنا وہ کیا کہتا ہے۔" رومی نے خود ہی شیلا کو یاد دلایا

"ہاں تو کیا کہا ہے ڈاکٹر نے آخر؟" شیلا نے گھبرا کر پوچھا۔

"ڈاکٹر نے کہا ہے ـــــ مرض لاعلاج ہے۔" رومی نے مسکرانا چاہا لیکن اس کے ہونٹوں پر ایک خشک سی حرکت کے سوا اور کچھ نہ تھا۔ ۔ ۔

۔ ۔ ۔ اور وہ شیلا کے کمرے سے باہر چلا آیا۔

کہانی

"دیدی! میں تمہارے ساتھ سوؤں گا۔"

چنتے نے کمبل کا کنارہ اٹھا کے کہا۔

"میرا چنتا!"

"دیدی! یہ پھول کتنا حسین ہے۔"

قمیص کے بٹن میں سے پھول اُتار کے چھوٹا سا چنتا اپنی بہن کے بازوؤں میں سرک گیا۔

"حسین ہے۔" دیدی نے پھول اپنی آنکھوں پر رکھتے ہوئے کہا۔

"لیکن اس سے بھی زیادہ حسین ہیں وہ لمحات جو اس کے ساتھ بسر ہوئے ہیں۔" دیدی نے ذرا ٹھہر کے کہا۔

چنا دیدی کے چہرے کی طرف دیکھنے لگا۔

"کہیں لکھا ہوا تھا اور کچھ بھی حسین نہیں ہوتا۔ صرف وقت کے وہ لمحات حسین ہوتے ہیں۔ جو زندگی کی تیرہ و تار رات میں روشن ستاروں کی طرح جگمگا اُٹھتے ہیں۔"

"آسمان میں کتنے بڑے تارے ہوتے ہیں؟"

چنے کو تاروں کے سوا دیدی کی بات میں اور کچھ بھی سمجھ میں نہیں آیا تھا۔

دیدی خاموش تھی۔

"دیدی! تم اُداس کیوں ہو؟"

"میں اُداس کیوں ہونے لگی میرے آسمان میں بھی ویسے ہی تارے موجود ہیں۔" بہن نے ننھے سے بھائی کو اپنے بازوؤں میں بھینچ لیا۔

"میرے آسمان میں بھی ویسے ہی تارے ہیں۔ گو تھوڑے ہیں۔ لیکن ہیں بہت گہرے اور روشن۔"

بہن کے ہونٹ چنے کے رخساروں سے مس ہو گئے۔

"آج دیدی بہت خوش ہے۔" چنے نے سوچا۔

"دیدی! مجھے سوال سمجھا دو۔"

"سوال؟"

"ہاں دیدی! بہت مشکل ہیں۔۔۔۔ ماسٹر نے اتنے بڑے بڑے سوال دے

دئے ہیں۔ پہلے اُس نے ایسے سوال سمجھائے بھی نہیں۔۔۔۔"

چنے کی شکایت بہت معقول تھی۔

"زندگی میں ان کٹھن سوالوں کے حل ہی تلاش کرنے پڑتے ہیں میرے چنے!" چنے کے بائیں رخسار پر دیدی نے انگلیاں پھیرتے ہوئے کہا۔

"دیدی! تم میرے بڑے بڑے سوال بھی سمجھ لوگی کیا؟"

"تمہارے تو میں بڑے بڑے سوال بھی سمجھ لوں گی۔۔۔۔۔ لیکن ۔۔۔۔۔" چنے کو ایسا محسوس ہوا جیسے اس کی گال پر دیدی کی انگلیاں سرد ہو گئی ہیں۔

"دیدی! لیکن کیا؟"

"لیکن میرے سوال۔۔۔۔۔"

دیدی کی خالی خالی آنکھیں اوپر چھت کی طرف دیکھنے لگیں۔۔۔۔ ماں بننے والی ایک چڑیا نے چھوٹا سا گھونسلہ بنا کے اور تھوڑے سے تنکے اکٹھے کر کے زندگی کے اتنے بڑے سوال کو جھٹ حل کر لیا تھا۔

"تمہارے سوال؟" چنے نے بہن کی طرف دیکھا۔

دیدی نے جواب میں صرف سر ہلا دیا۔

"میرا ماسٹر سب سوال حل کر لیتا ہے۔ مجھے دو اپنے ماسٹر سے حل کرا دونگا۔" چنا دیدی کی گود میں سے اٹھ کے بیٹھ گیا۔ وہ بہن کی خاطر

اسی وقت اپنے ماسٹر کے پاس جانے کو تیار تھا۔

"پاگل!...... تمہارا ماسٹر بیچارہ" دیدی نے ہنس کر کہا اور اٹھ کے بیٹھ گئی۔

"ابھی یہ سوال کسی کی سمجھ میں نہیں آتے...... اور معلوم نہیں کب تک نہ آئیں گے۔" سامنے کھڑکی میں سے بادل نہ معلوم کونسی ہوا کے جھونکے سے تہ و بالا ہوتے دکھائی دیئے۔

دیدی نے اپنا سر سرہانے پر رکھ دیا۔ چنّے کا دل بھی سوال سمجھنے کو نہ چاہا۔ اسے وہ رات والی کہانی یاد آ گئی۔

"دیدی رات والی کہانی سُنا دو۔"

سردی بھی کافی تھی۔ چنّا اپنے ننھے ننھے پاؤں دیدی کے پاؤں میں ڈال کے بیٹھ گیا۔

"دیدی کہانی پوری کر دو نا۔"

"چنّے کہانیاں پوری ہونے کے لئے نہیں ہوتیں...... تم چاہتے ہو...... اچھا ایک تھا شہزادہ، اس کے پاس بڑے بڑے محل، سونے کے تخت اور بہت سے نوکر چاکر تھے۔ ایک دن وہ گھوڑے پر سوار ہو کے شکار کھیلنے گیا۔ اس نے ایک پری چہرہ شہزادی دیکھی، جس کے لمبے لمبے بال سونے کی تاروں کی طرح چمکدار اور سنہری تھے

...... شہزادہ اُس سے محبت کرنے لگا، اور...... تم آگے سننا چاہو گے......؟

"شہزادہ اسے سونے کی پالکیوں میں بٹھا کے بیاہ لایا۔ ٹھیک ہے نا دیدی! میں نے جان لیا...... کہانی جان لی میں نے۔"

"لیکن چنّے......" دیدی خاموش ہو گئی۔

"کیا یہ درست نہیں؟ لیکن دیدی! پھر یہ کہانی مکمل کیسے ہو گی؟"

"چنّے! ادھوری کہانی...... وہ مکمل ہوتی ہی کب ہے؟"

چنّا اس سے پیشتر بہن کے بڑے بڑے اور گرم پاؤں میں اپنے ٹھٹھرے ہوئے ننھے پاؤں ڈال کے پھر سے گرما لیا کرتا تھا۔

...... لیکن آج چنّے کو دیدی کے پاؤں سے گرمی حاصل نہیں ہو رہی تھی...... بلکہ وہ بہت سرد سے محسوس ہو رہے تھے...... چنّے نے اپنے پاؤں کھینچ لئے...... اُس کی دیدی نے اسے گود میں بٹھا لیا۔ اور کمبل کا سرا اس کی ٹانگوں پر ڈال دیا۔

"دیدی! کہانی کبھی پوری نہیں ہوتی؟" چنّا آج بیحد حیران تھا۔

"پوری ہوتی ہے...... صرف میرے چھوٹے سے عزیز بھائی کی آنکھوں میں...... میرے رات کے سپنوں کے اندر۔"

چنّا بہن کی گود میں اور پسر گیا۔

"مجھے تو پوری کہانیوں سے مزہ آتا ہے۔"

"ہاں چھنّے! چھوٹی عمر میں کہانیوں کو پورا کرنے ہی میں مزا آتا ہے لیکن بڑے ہو کے سب..... پوری کہانیاں بھی ادھوری کر دیتے ہیں۔"

"بڑے ہو کے سب ہی کہانیوں کو توڑ کے خراب کر دیتے ہیں؟.... بھلا انہیں کیا لطف آتا ہے؟"

"کاش معلوم ہو سکتا کہ انہیں کیا لطف آتا ہے۔"

چھنّے کی دیدی سکڑ کر اس کے ساتھ ہی لیٹ گئی۔

"بابوجی اور بھائی صاحب بھی پوری کہانیوں کو توڑ دیتے ہیں کیا؟"

دیدی خاموش رہی کوئی جواب نہ دیا۔ چھنّے کو اپنی پیشانی پر کسی شے کی لمس محسوس ہوئی۔ اُس نے آنکھیں اوپر اٹھا کے دیکھا۔ اس کی دیدی کی آنکھوں سے آنسو بہہ کر اس کی پیشانی پر گر رہے تھے۔

چھنّے کو یوں محسوس ہوا جیسے اُسکی دیدی کی کوئی کہانی ٹوٹ گئی تھی۔

"دیدی تم رو رہی ہو..... میں جا کے پوچھتا ہوں بابوجی سے، وہ کہانی توڑتے کیوں ہیں۔"

"چپ کر کے سوتے ہو یا نہیں۔ نہیں تو جاؤ اپنی چارپائی پر۔" دیدی نے نہ معلوم کیوں اُسے جھڑک دیا..... ننھا چھنّا جہاں تھا وہیں لیٹ گیا۔ دیدی نے سر تکیے پر رکھ دیا۔ اور دائیں بازو سے دونوں آنکھیں ڈھانپ لیں۔

کتنے سال پہلے

"............."

اور مجھے محبت ہو گئی..... جے شری راگنی سے..... میں جانتا تھا بھاگ راگ کتنا دردناک ہوتا ہے، بھیرویں کتنا شیریں، سندرا کتنا پُرجوش..... لیکن آہ جے شری..... مدھم جھپٹرول پنچم بولے.....

..... میں بجاتا کچھ اور تھا اور بجتا کچھ اور تھا، اور میں یہ بھی جانتا تھا کہ کیوں؟

..... کیونکہ تمہارا نام جے شری تھا اور میں یہ بھی سمجھتا تھا کہ اگر تمہارا نام جے شری کی بجائے جے ونت ہوتا تو مجھے بجائے جے شری راگنی کے جے جے ونتی ہی اچھی لگتی۔ میرا حال کسی اس دوشیزہ سے پوچھیں جو کسی کیدار نام کے لڑکے سے محبت کرتی ہو۔ اور اُسے پھر پوچھیں کیدار راگ

کا نام سُنتے ہی اس کے دل میں کیا ہوتا ہے۔ خیر ایک دوسرے سے مشابہ ناموں سے، رنگوں سے، نقوش سے کچھ ہوا ہی کرتا ہے۔

زمانہ گذر گیا ہے، ایک زمانہ، لیکن آج دہرانے کو جی چاہتا ہے۔ کیوں جے شری! تمہیں یاد ہے، تمہیں لکھنا نہیں آتا تھا، لیکن تمہارے پاس وہ کچھ تھا۔ . . . . (میرا گلا رک گیا ہے، میرا قلم بھی رُک گیا ہے) . . . . ہاں تو سن سکتی تھی، اچھی طرح سُن سکنا اچھا لکھ سکنے سے کم نہیں ہوتا۔ لکھنے والے کو اپنے لکھے کی پُوری قیمت وصول ہو جاتی ہے، اگر اسے کوئی اچھی طرح سُن لے ـــ اور میں جب بھی کوئی نئی کہانی لکھتا تھا، تو میری پہلی خواہش یہی ہوتی تھی کہ تم اُسے سُن لو ـــ اسے ـــ میری کہانی کو، میری چھوٹی سی کہانی کو . . . . اور لوگ چاہے لاکھ سُنیں لیکن میری کہانی بھی اُس بچے کی طرح ہوتی تھی جو کسی کے بہلانے سے بہلتا نہیں جب تک اُس کی ماں اُسے گود میں نہ لے لے ـــ اور جب کبھی میں کوئی نئی فلم دیکھا کرتا تھا، چار گھنٹے کا سفر، تین چار روپے کرایہ، اور سارے دن کی پڑھائی کا حرج میں اس لئے کر کے تمہارے پاس پہنچا کرتا تھا، کہ تم اس فلم کی کہانی سب سے پہلے میرے منہ سے سُنو، اور کبھی کبھی . . . . . . میں کوئی نئی کتاب صرف اس لئے پڑھا کرتا تھا، کہ تمہیں کوئی نئی چیز سنا سکوں۔ میں اپنے کپڑوں کے متعلق شروع ہی سے بے پروا نہیں

تھا۔ ایک وقت تھا جب میرے کوٹ کے کالر پر ایک بھی شکن نہیں ہوتا تھا۔ لیکن اس کے بعد میں اپنے کمرے میں اس لئے خود ہی کوئی شکن سا ڈال دیتا تھا، کہ تم آؤ گی، تھوڑی سی سرزنش کرو گی، اور پھر وہ شکن نکال دو گی۔ میں تمہارے انتظار میں شکن پر شکن ڈالنے کا عادی ہو گیا، اگر آج آ کے تم میرا کمرہ دیکھو تو ـــ ہر طرف شکن ہی شکن دکھائی دیں گے، ان شکنوں نے اسے شکن در شکن بنا رکھا ہے۔ اور شکن ڈالنا اب میری سرشت میں داخل ہو گیا ہے۔ میں چاہتا تو تھا کہ زندگی کو ایک عمیق ترین مضبوط محبت دوں، ہر وقت بلکتے اور رونے والے پیار کو میں نے شروع ہی سے قبول نہیں کیا تھا۔ رو سکنا مجھے اچھا لگتا تھا۔ لیکن ہنس ہنس کے رو سکنا ـــ آنسوؤں کے ساتھ تو ساری دنیا روتی ہے ـــ ہاں تو میں اپنے کمرے میں شکن ڈالنے لگا۔ اس سے پہلے جو شکن میں ڈالتا تھا، تم آ کے اُسے نکال دیا کرتی تھی۔ لیکن پھر تم نے آنا چھوڑ دیا۔ شکن بڑھتے گئے۔ اور آہستہ آہستہ میں شکنوں کا عادی ہو گیا۔ میرا بستر اکھٹا ہُوا ہُوا، میری میز کی چادر ایک طرف لٹکتی ہوئی۔ اور میرا آئینہ گرد و غبار سے اٹا ہُوا۔ لیکن مجھے ایک امید تھی ـــ وہ یہ کہ چاہے تم نے میری تحریروں کو مجھ سے سننا چھوڑ دیا ہے لیکن تم انہیں پڑھنا نہیں چھوڑ سکتی۔ اور اگر فی الحال تم نے کچھ عرصے کے لئے انہیں پڑھنا بھی چھوڑ دیا ہے۔ تو کبھی نہ

کبھی وہ وقت ضرور آئے گا جب تم کتب فروش کی دکان پر آؤ گی، دکاندار کی طرف دیکھو گی، شاید تھوڑی جھجک بھی محسوس کرو گی، لیکن پھر نیچی نگاہ کرکے آہستہ سے کہہ ہی دو گی ——" آپ کو تکلیف تو ہو گی لیکن مجھے پرانے رسالوں کے وہ تمام پرچے نکلوا دیں جن میں نیل کنٹ کی کوئی چیز شائع ہوئی ہو —— بتدریج میرا خیال پختہ ہو گیا۔ جس طرح ہوا میں منڈلانے والے بادل ایک تصویر کی صورت بن جاتے ہیں۔ پہلے میں یہ سوچا کرتا تھا، آج شام ہو گی، کتب فروش جب اپنی دکان بند کرکے گھر کو جاتا ہوا ادھر میری بیٹھک کے آگے سے گذرے گا۔ میں کھڑکی میں کھڑا ہونگا۔ وہ اوپر نگاہ کرے گا۔ پھر وہ ہاتھ ہلائے گا، میں بھی ہلا دونگا۔ پہلے تو وہ ہر روز اتنا کرکے ہی گذر جایا کرتا ہے۔ لیکن آج رُک جائیگا۔ جس طرح وہ کبھی کبھی رُک جایا کرتا ہے، اور میں سمجھوں گا کہ شاید میرے ساتھ کتابوں سے متعلق اُسے کوئی بات کرنا ہے۔ جیسا کہ وہ کبھی کبھی کہا کرتا ہے میں اُسے اوپر کوٹھے پر بلا لونگا۔ وہ بیٹھ جائے گا اور دریافت کریگا کوئی نئی چیز لکھی ہے آپ نے؟ میں تھوڑا سا ہنس کے جواب دونگا" آپ کے لئے یہ چیزیں نئی ہوتی ہیں، اور ہمارے لئے آج سے کئی سال پہلے ....." وہ بھی ہنس دے گا اور میں بھی، ہم ایک دوسرے کے دوست جو ٹھہرے اور پھر وہ پہلے کی طرح اپنی سرسری آواز میں کہے گا" آج ہماری دکان پر

ایک لڑکی آئی تھی"۔ وہ میری طرف دیکھے گا اور ساتھ ہی کہے گا۔" کہتی تھی آپ کو تکلیف تو ہو گی لیکن مجھے تمام پرانے رسالوں کے وہ پرچے نکلوا دیں جن میں کبھی کبھی نیل کنٹ کی کوئی چیز شائع ہوئی ہو" میں اُس کی طرف دیکھتا ہی رہ جاؤں گا۔ اور وہ کہنے لگے گا" دبلی سی تھی وہ لڑکی نہایت حسین اس کے خدوخال ....." (معاف کرنا جے شری مجھے تمہارے خدوخال یاد رکھ سکنے کا اگر زیادہ نہیں تو تھوڑا سا حق تو ضرور ہے) میں اپنے ٹھنڈے سانس کو حلق میں اتار لینے کی کوشش کروں گا" ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس لڑکی کو کبھی آگے بھی دیکھا ہے، فتنا سا سا حسین چہرہ ...... بہت مدت ہوئی شاید کبھی آپ ہی کے مکان پر....."

دنوں پر دن، ہفتوں پر ہفتے، پھر مہینے اور سال اور کئی سال گذرتے چلے گئے۔ وہ دکاندار مجھے اور تو سب کچھ پوچھتا رہا۔ بتاتا رہا، لیکن اس نے کبھی نہ کہا کہ آج ہماری دکان پر ایک لڑکی..... پھر رفتہ رفتہ کیا ہوا میں نے اس کی دکان پر جانا شروع کر دیا۔ خریدار آتے، سائیکلوں پر، تانگوں پر، اور موٹروں پر..... موٹروں پر آنے والوں کو دکاندار دکان سے باہر جاکے اپنے ساتھ اندر لے آتا، تانگوں پر آنے والوں کا دکان کی دہلیز پر استقبال کرتا، اور سائیکلوں پر آنے والوں کو صرف کرسی پر سے اٹھ کے اپنی توجہ دے سکنا کافی خیال کرتا، اور جب کوئی پیدل

آتا تو وہیں سے بیٹھے بیٹھے اپنے کسی نوکر سے ادھر متوجہ ہونے کو کہہ دیتا۔ اسی طرح کتابوں کی باتیں، پیسوں کی باتیں اور دوسری کئی ادھر ادھر کی باتیں میں سنتا رہتا۔ بسا اوقات راستے کا چکر کاٹ کے بھی میں اس دکان کے آگے سے گذرتا۔ گھڑی پل رکتا اور پھر چل دیتا۔ میں جانتا تھا کیوں؟ تمہیں میری چیزیں لینے آنا ہے، کبھی نہ کبھی آنا ہے۔ ضرور آنا ہے، اور کیا معلوم کہ شاید اسی وقت ......؟

یہ کئی سال پہلے کی باتیں ہیں ...... اس وقت میرے بال میری مایوسی سے بھی زیادہ سیاہ تھے۔ رفتہ رفتہ تمہاری یاد میرے اندر یوں سماتی چلی گئی جس طرح پانی کے اندر نمک کی ڈلیا گھل کر سما جاتی ہے۔ ڈلیا کا اپنا وجود نابود ہو جاتا ہے۔ لیکن پانی کچھ نمکین ہو جاتا ہے۔ تمہیں یاد کرنا، تمہاری باتیں کرنا اور حیلوں بہانوں تمہارا نام لینا میں نے چھوڑ دیا، لیکن اندر ہی اندر میں اُس پانی کی طرح ہو گیا جس کے اندر نمک کی ڈلیا حل ہو چکی ہو۔ یاد رفتہ کے ساتھ ساتھ مایوسی کا رنگ بھی بدلتا گیا اور وہ اتنی تاریک نہ رہی۔ اور میرے بال جو کئی سال پہلے میری مایوسی سے بھی زیادہ سیاہ تھے انہوں نے بھی اپنا رنگ بدلنا شروع کر دیا —— اور آج —— جس طرح کسی تیوہار کا ہم سال بھر انتظار کرتے ہیں کہ کب آئے گا، ابھی اتنے دن باقی ہیں، اب اتنے دن رہ گئے ہیں۔ اور پھر جب وہ تیوہار آتا ہے، ایک ہی

دن میں گذر جاتا ہے، اسی طرح آج وہ طویل انتظار کئی سال پہلے کا خیال ...... دکاندار آج شام کے وقت آیا اور اس نے کہا "آج ایک لڑکی ہماری دکان پر آئی تھی"۔ مجھے بھولی ہوئی کوئی یاد آ گئی، اور اس یاد کے ساتھ ہی میرے بدن میں جھرجھری —— لیکن میں پل بھر کے لئے بھول گیا کہ تم کئی سال پہلے کی لڑکی اب لڑکی نہیں رہی۔ دکاندار نے کہا "وہ کہتی تھی۔ آپ کو تکلیف تو ہو گی، لیکن وہ تمام رسالے، اخبار اور کتابیں نکلوا دیں جن میں کبھی نیل کنٹ کی کہانیاں چھپی ہوں"۔ اور جے شری! دکاندار کی یہ بات سن کے مجھے یوں محسوس ہوا جیسے یہ تو ضرور ہونا ہی تھا، تمہیں آنا ہی تھا اور تم آ گئیں —— عمر کے ساتھ ساتھ مجھ میں متانت آ گئی ہے۔ وہ شباب کی تلخی نہیں رہی۔ آج بڑھاپے کی سنجیدگی ہے۔ دکاندار کہنے لگا "میں نے اس سے کہا میں کوشش کرونگا۔ پرانی چیزیں ذرا دور رکھی ہیں، کتابیں تو قریب ہی ہیں لیکن رسالے ......" وہ کہنے لگی "نہیں آپ کو ابھی تکلیف کرنی ہو گی۔ مجھے امی جی نے کہا ہے آج ہی لے کے آنا"۔

"آہ جے شری! اگر اجازت دو تو کہہ لوں" میری جے شری! مجھے معلوم تھا —— تمہیں میری چیزوں کی ضرورت پڑے گی، ضرور پڑے گی، مجھے معلوم تھا ...... آج سے کئی سال پہلے ...... معلوم تھا ......

تمہارا نیل کنٹ

نوٹ۔ کسی جذباتی ولولے کے زیرِ اثر میں نے یہ خط لکھنا شروع کیا تھا۔ کچھ دُہرانے کو جی چاہتا تھا، دہرالیا ہے لیکن خط کے ختم ہونے کیساتھ میرے جذبات کے اُمنڈ رکنے والے جوش میں کچھ سکون سا آگیا ہے میں یہ خط تمہیں نہیں بھیجونگا، ہاں اُن زبانی خطوں کی طرح جو میں تے ہزاروں کی تعداد میں تمہیں بھیجے ہیں .... کئی سال پہلے ... اُن خطوں کی طرح اسے بھی بھیج دونگا۔ اچھاجے شری! میں اسے اخبار میں شائع کرا دوں گا۔ خط کی طرح نہیں ایک افسانے کی طرح۔ تمہارا نام بھی بدل دونگا۔ پھر جب کبھی تم میرے اس افسانے کا مطالعہ کروگی، تمہیں معلوم ہو جائے گا کہ یہ خط تھا ـــــ لیکن خط کی ضرورت بھی کیا ہے جبکہ تم ابھی میری تحریریں یا میرے افسانے خود پڑھ رہی ہو، یا اپنی لڑکی سے سُن ـــــ رہی ہو۔ وہ بھی تو خطوط ہی ہیں، وقت وقت پر الگ الگ صورتوں میں ـــــ تمہاری ہی تو باتیں ہیں ـــــ چاہے ہوئی تھیں ـــــ کئی سال پہلے ...... سال ...... پہلے ......"

نیل کنٹھ

کلی

اپنی تصویر اتروانے کے نام سے اسے بچپن ہی سے ایک قسم کی چڑ تھی، اس لیئے ہوش سنبھالنے کے زمانے سے پہلے کی بھی اُس کی کوئی تصویر نہیں تھی۔

بات یوں ہوئی، ایک مرتبہ چھوٹے چھوٹے بچے دو دو ساتھی بن کے کوئی کھیل کھیلنے لگے۔ سب نے اپنا اپنا ساتھی چُن لیا۔ وہی ایک خالی رہ گئی، اور ایک اس کا پڑوسی موہن۔ اب اُنہیں ضرور ایک دوسرے کا ساتھی بننا ہی تھا، لیکن موہن نے کہا: "میں اس کا ساتھی نہیں بنوں گا۔ میں اتنا خوبصورت ہوں، اور یہ کالی کلوٹی لڑکی:" اس کا دل یہ چوٹ برداشت نہ کر سکا۔ وہ رُوٹھ گئی، اور کھیل چھوڑ کے ایک درخت

کے نیچے تنہا جا بیٹھی۔ بعد میں کئی لڑکے بھاگے بھاگے آئے، اور کہنے لگے "کلی: میں تمہارا ساتھی بنوں گا"۔ لیکن وہ نہ مانی اور نہ ماننا تھا اُسے۔

اُس دن کے بعد وہ اپنے آپ کو ہمیشہ تنہا محسوس کرتی رہی۔ اُسے یوں معلوم ہوتا تھا، جیسے اس کی تمام تر زندگی تنہا ہے۔ اُسے کچھ سہم سا ہو گیا تھا "اگر میں تصویر اُتروا ؤں اور کوئی کہہ دے۔ یہ لڑکی تو سیاہ فام ہے۔ بچہ" اس درد کی یاد ہی کافی دردناک تھی۔ اس لئے وہ گھر میں آنے جانے والے کسی شخص سے حتی الوسع ملتی بھی نہیں تھی۔ مبادا کوئی کہہ دے۔۔۔۔ سارا سارا دن کمرے کے اندر بیٹھے رہنے سے اُس کی صحت بگڑنے لگی۔ اس کی ماں نے بمشکل اُسے اِس بات پر رضا مند کر لیا تھا، کہ وہ دِن ڈھلے کوٹھی کے عقب میں گھڑی دو گھڑی کے لئے اکیلی ہی چہل قدمی کر لیا کرے۔ اُس نے اپنے والد سے منوا لیا تھا کہ اس کا اتالیق بھی کوئی بوڑھا شخص ہو جسے کبھی یہ خیال نہ آئے، کہ اس کی شاگرد سیاہ فام لڑکی ہے۔ اس کے دل میں حسرت تھی کہ میرا نام والدین نے "نو کلی" کیوں رکھ دیا ہے، اور اگر رکھا ہے تو میں ایک نازک کلی کی طرح حسین کیوں نہیں ہوں"۔ اُس کی ماں کبھی کبھی محبت سے اُس کا سر اپنی گود میں رکھ کے کہا کرتی تھی "تم ایک ننھی کلی کی طرح نازک، پتلی دُبلی اور شبک سی لڑکی ہو"۔ لیکن وہ خاموش ہونٹوں کے

اندر ہی اندر اپنے دل کے یہ الفاظ دبا لیا کرتی تھی "کاش میں سفید کلی کی طرح حسین بھی ہوتی"۔

اب وہ جوان تھی۔ اسے ایک شوق تھا ستار بجانے کا، لیکن اُس نے کسی کو نہ کبھی ستار بجا کے سنائی تھی، اور نہ اپنے دل کی کوئی بات۔

وہ اپنے باغیچہ میں لگے ہوئے گلاب کے پودوں پر بند کلیاں دیکھا کرتی تھی، لیکن وہ کلیاں تو دوسرے دن شگفتہ ہو جاتی تھیں اور وہ دل ہی دل میں کہا کرتی "میرے خالق! تم مجھے انسانی کلی بنانے کے بجائے اگر گلاب کی کلی بنا دیتے تو۔۔۔۔۔ تو میں بھی شگفتہ ہو سکتی کوئی پھول بن سکتی"۔ اور کسی وقت وہ فخر کے ساتھ سوچنے لگتی "باغیچے کی کلیاں ستار بھی تو نہیں بجا سکتیں"۔ اور اس پُر درد لمحے اُس کے دل کا زخم پھوٹ نکلتا۔

"باغیچے کی کلیاں خوبصورت ہیں، لیکن تم تو۔۔۔۔" اُس کے آنسوؤں کا ایک قطرہ بھی اتنا لمبا ہو جاتا کہ وہ ستار کی تمام تاروں کو سر سے پاؤں تک تر بتر کر دیتا۔ اُس کے دل کی نازک تاریں دُکھ جاتیں، اور وہ خود اپنی نظروں میں مجرم بن جاتی

اب وہ کافی جوان ہو گئی تھی۔ والدین کو کچھ اور ہی فکر دامن گیر تھی۔ اور اسے کچھ اور۔ انہوں نے سنا کہ ان کی برادری کے ایک

خوبصورت نوجوان نے اِس سال ایم اے کے امتحان میں اوّل رہ کر بہت شہرت حاصل کی ہے۔ انہوں نے اس لڑکے کو اپنی کوٹھی میں چائے پر مدعو کیا۔ والدین کی خواہش تھی کہ چائے پیتے وقت "نوکلی" بھی ان کے ساتھ بیٹھے۔ اور اس سے زیادہ اُنکی کچھ اور بھی مرضی تھی لیکن کلی کسی اجنبی مہمان کے روبرو کس طرح ہو سکتی تھی۔ خصوصاً اُس حالت میں جبکہ اس مہمان کے سامنے اُس کی منگنی کی تجویز پیش کی جانی تھی۔ اُس کے دل میں ایک ٹیس سی اٹھتی "میں تو ایک سیاہ۔۔ ۔۔۔۔" اس نے وہاں جانے سے انکار کر دیا۔ آخر کلی کے باپ نے اُس نوجوان کو اس بات پر رضامند کر لیا کہ لڑکی کی تصویر دیکھ لینا کافی ہو گا۔ باقی سب کچھ ٹھیک ہے۔ لیکن کلی کا دل کسی نادیدہ شئی کا تخیل کر رہا تھا۔

"نہیں، میں تو ایک خوبصورت لڑکا ہوں، لیکن یہ سیاہ فام سی لڑکی ۔۔۔۔۔" بچپن کی یہ بات اُسے اس طرح محسوس ہوئی، جیسے آج کی بات ہو اور کہنے والا موہن کی بجائے آج یہ نوجوان ۔۔۔۔

وہ رونے لگی۔ تصویر بنوانے سے اس نے انکار کر دیا۔ آخر لڑکے کی منگنی کسی دوسری جگہ ہو گئی۔

اس نے اپنی ستار کو چھیڑا ع

اک تنہا باسی ہوں میں اور اجڑا ہے میرا دیش

اس کے گلے سے آواز نکلی اور ستار نے بھی کہا:۔

اِک اکیلی باسی ہوں میں اور اجڑا ہے میرا دیش

گویا ستار بھی اس کی ہاں میں ہاں ملا رہی تھی۔

اس کے تمام گیت احساسِ تنہائی سے لبریز تھے۔ کیونکہ اس نے تنہائی میں پرورش پائی تھی۔ تنہائی اس کا شباب تھی، اور تنہائی ہی اُس کی زندگی تھی۔ اگر اس کی زندگی میں کوئی اس کا ساتھی بننے والا آیا بھی تھا۔ تو "سیاہ سی لڑکی" کا نوکدار تیر مار کے اس کے دل وجگر کو چھلنی کرنے والا ہی نکلا۔ بچپن کے اس کھیل کے ساتھی کے دو چھوٹے سے بول آسمان کی وسعت سے بھی زیادہ وسیع ہو گئے تھے۔ ماں باپ کے آنسوؤں کا بوجھ اس کی کشتیِ حیات کو اور بھی ڈگمگا رہا تھا۔

"نوکلی کی زندگی یونہی گذر جائے گی" والدین کی پوری نہ ہونے والی تمنائیں اس کے نازک دل کے تازہ زخموں پہ اور بھی نمک پاشی کرتی تھیں۔

ہاں ایک مشکل اس کے موسیقی کے اُستاد کے بھی درپیش تھی جو گیت وہ سیکھنا چاہتی تھی، وہ تو کہیں سے تلاش کر کے لا نہیں سکتا تھا۔ اور جو وہ سکھا سکتا تھا، اُسے سیکھنے سے وہ قاصر تھی۔

محبت کے گیتوں، ساقی کے گیتوں اور خوشیوں کے گیتوں سے وہ یوں گھبرا جاتی تھی، جس طرح کوئی بچہ کسی اجنبی نظارے سے چونک اٹھتا ہو۔ اور جن گیتوں کے اندر زندگی کی تنہائی کی پت جھڑ ہوتی، وہ اُن گیتوں کی طرف اس اشتیاق سے رجوع کرتی، جس طرح دلہن سے دُور کسی بچھڑے مسافر کو اجنبی چہروں کی بھیڑ میں اچانک کوئی جانا پہچانا چہرہ دیکھ کے مسرّت حاصل ہوتی ہے۔

وہ اپنے آپ سے کہتی: "تمہارے حسین سینے کی سنہری جگمگاہٹ کو نیلے کالے بادلوں نے کتنی گہری تہوں کے اندر چھپا لیا ہے کہ اس حسن کی سرخی کا کوئی کنارہ بھی گہرے بادلوں کا سنہرا نہیں بن سکا۔

× × × × × × ×

وہ شاعر تھا۔ اس کی شاعری اُس سورج کی مانند تھی، جس کی طرف لوگوں کی آنکھیں یوں اٹھ جاتی تھیں جس طرح سورج مکھی پھولوں کی آنکھیں۔ نوکلی نے بھی اس جادو اثر شاعر کی بابت سنا اور پھر اسے بُلا بھیجا۔ کلی کی انگلیوں نے ستار کو چھیڑا، ہونٹوں نے دل کا کہا مانا اور ستار نے انگلیوں کا ..... کلی شاعر کی نظم گا رہی تھی۔ جیسے

سناؤں کیسے دل کی بات

دونوں دو الگ الگ کمروں میں رہتے۔ درمیان میں ایک پردہ حائل تھا۔

"ستار والی! تاریں ستار کی چھیڑو، دل کی نہ چھیڑو۔" شاعر نے کہا۔

"گیتوں والے! گیت ہی سناؤ۔ دل کی لگی نہ سناؤ۔" اُس نے جواب دیا۔

"کیا یہ سنہری کرن میں دیکھ نہ سکوں گا؟" شاعر نے پوچھا۔

— "لیکن یہ سنہری کرن سیاہ بادلوں میں چھپی ہوئی ہے۔" نوکلی نے چونک کر جواب دیا۔

"سیاہ بادلوں کے اندر روزِ روشن سے زیادہ منوّر شاعری موجود ہے" اُس نے کلی کی موٹی موٹی چمکدار آنکھوں کے اندر جھانکتے ہوئے کہا۔

"دیکھو کلی! یہ ہے تمہاری تصویر۔"

"کہاں؟" گھبرائی ہوئی آواز میں کلی نے دریافت کیا۔

"یہاں۔" اور اس نے اپنی آنکھیں کلی کی آنکھوں میں گاڑ دیں۔

جے دیو

نہ معلوم خدا نے روح کے دو ٹکڑے کیوں کر رکھے تھے، پاؤں میں "تلاش" آنکھوں میں "امید" اور وہ دونوں ٹکڑے ایک ہو جانے کے لئے ترستے رہتے تھے۔

بچے کی بھوک جتنی پاکیزگی کے ساتھ ماں کی چھاتیوں میں دودھ اتار دیتی ہے، اتنی ہی سچائی کے ساتھ اپنی روح کے ایک حصے کا پرتو دوسرے حصے کو جنم دیتا ہے ــــ جے دیو یوں سوچ رہا تھا سنگترے کے چھلکے اُس کے سامنے پڑے تھے۔ اور وہ اپنی یاد کے ٹکڑوں کے مطابق ان چھلکوں کے چھوٹے اور بڑے ٹکڑے کئے جا رہا تھا۔ ایک ٹکڑا اُس نے الگ کر کے رکھ دیا ــــ پھر اُس

سے ذرا دور تین یکساں ٹکڑے رکھ دیئے۔ اُن تینوں میں سے ایک ٹکڑا ذرا آگے بڑھا دیا۔ اب جے دیو کو یوں محسوس ہوا۔ سچ مچ تینوں میں سے ایک لڑکی ــــ اس کی میراں کی سہیلی۔ آگے آگے چلی آ رہی تھی۔ ایک طرف الگ کھڑے ٹکڑے کو . . . . یعنی جے دیو کو خود ــــ کچھ ہوا۔

کسی پرندے کو اگر ہر روز کسی معین وقت پر روٹی کا ٹکڑا دیا جائے۔ اور اگر اس سے ذرا پہلے ایک گھنٹی بھی بجائی جائے، تو آہستہ آہستہ پرندے کو عادت ہو جائیگی۔ اور گھنٹی کی آواز سنتے ہی اس کے منہ میں پانی آ جائے گا۔ اور وہ جان جائے گا کہ روٹی کا ٹکڑا آنے ہی والا ہے ــــ ہاں جے دیو نے اپنے ہاتھ سے چھلکے کے تین ٹکڑوں میں سے ایک ٹکڑا آگے بڑھا کر رکھ دیا۔ اب ایک طرف الگ کھڑے ٹکڑے کو کچھ ہوا۔ تیسرے ٹکڑے کا آگے بڑھنا اُس گھنٹی کی علامت تھی جس کے بعد اصلی روٹی کا ٹکڑا یعنی جے دیو کی میراں آنے والی تھی۔ کالج میں صبح ساڑھے دس بجے ــــ گو جے دیو کو یاد آ گیا ــــ ایک دو مرتبہ ایسا بھی ہوا تھا، کہ میراں نہیں آئی تھی۔ لیکن جے دیو کو تو پہلے ہی اس تیسری لڑکی کو دیکھ کر ہی کچھ ہو چکا ہوتا تھا۔ جس طرح گھنٹی بجانے کے بعد پرندے کو اگر روٹی نہ بھی دی جائے

تو بھی اُس کے منہ میں تو گھنٹی کی آواز پر ہی پانی آجاتا ہوگا۔

جے دیو نے اب چھلکے کے تیسرے ٹکڑے کو آگے بڑھا دیا۔ باقی دونوں کو اپنے ہاتھ سے ایک طرف الگ کھڑے ٹکڑے کے قریب لاتا گیا۔ ان دونوں میں سے جو الگ کھڑے ٹکڑے کے اس طرف تھا، اُسے جے دیو نے ہاتھ سے اس طرف کر دیا۔ اب جے دیو کے ہاتھ کانپنے لگے۔ جس طرح کبھی ایک طرف الگ کھڑے میراں کو اپنی طرف آتا دیکھ کر اس کا دل کانپ جایا کرتا تھا۔

اس طرح جے دیو سنگترے کے چھلکے بکھیر کر گویا گذرے ہوئے زمانے کے حقیقی بتوں کے ساتھ کھیل رہا تھا۔ پھر جے دیو کے دل میں آیا زیادہ نہیں بمشکل تین ساڑھے تین سال کی بات ہے ہر صبح وہ سنگترے کے چھلکوں کا یہ کھیل زندہ بتوں میں دیکھا کرتا تھا۔ اور ہر شام کالج کے وقت کے بعد زندہ بتوں کا کھیل چھلکوں میں کھیلا کرتا تھا۔ لیکن اس وقت یہ کسے معلوم تھا، کہ اس کے لیئے پھر ساری زندگی کا کھیل صرف چھلکوں کا کھیل ہی رہ جائے گا۔

بائیں جانب سے کسی کا جھٹکا پڑا، جس طرح کبھی حقیقی بتوں کے ساتھ کھیلتے ہوئے شدنی کا جھٹکا پڑا تھا، اور کھیل بھول گئے تھے۔ جے دیو نے ہاتھ سے سنگترے کے چھلکے ایک طرف کر دیئے،

جس طرح کوئی جواری ایک ہی داؤ میں سب کچھ ہار کر جُوا کھیلنے کا سب سامان اٹھا کے رکھ دیتا ہے، آنے والے نے نیلگوں رنگ کی ساٹن کا ایک بڑا سا ٹکڑا اُس کے آگے رکھ دیا۔ گم سُم جے دیو نے کپڑا لے لیا، اور قینچی اٹھا کر اس کی کاٹ کرنے لگ گیا۔ کاٹ اتنی ہی خوبصورت بنتی جاتی تھی، جتنی کبھی شدنی نے کاٹ کر اور ایک ڈیزائن بنا کر اس کے آگے رکھی تھی۔ لیکن جے دیو کو ایک خیال آیا جس سے اس کے جسم میں جھرجھری سی محسوس ہوئی، جس طرح ٹھنڈی ہوا کے جھونکے سے ننگے جسم میں کپکپی آجاتی ہے —— وہ یہ کپڑا خود کاٹ کر، اپنی آنکھوں کے آگے رکھ کر کل شام کسی کے حوالے کر دیگا، جس طرح شدنی نے وہ حسین کاٹ بنا کر اُسے دکھا کے نہ معلوم کیوں کسی دوسرے کے ہاتھوں میں دے دی تھی۔

قینچی کو ادھر ادھر سے گھما کر آخر گریبان کی نوک تک لاتا تھا —— جہاں اس کی منزل تھی —— خیالات کا سلسلہ بھی کس طرح چلتا ہے، جے دیو کو یاد آیا جس طرح کالج کی لیبارٹری میں میز ایکسپیریمنٹ کرتے ہوئے انگلیاں ادھر ادھر گھما کر آخر کسی نشانے پر لاتا ہوتا تھا —— اور اسکے بعد جے دیو کو یاد آیا، کہ ایک دن میراں کسی دیو کنیا کی طرح آنکھیں بند کئے میز ایکسپیریمنٹ کرتی ہوئی انگلیاں گھما رہی تھی —— جے دیو پاس

گھڑا تھا۔ انگلیوں نے گھر تلاش کرنا تھا، ایک گھر ـــــ محبت کی سماجک ٹھوکروں کے ساتھ جدوجہد کی طرح، انگلیاں کبھی بلائنڈ گھر کے ساتھ جا ٹکراتی تھیں جہاں سے آگے کوئی راہ نہ تھی۔ پھر ادھر ادھر بھٹکتی اپنی راہ تلاش کرتی تھیں، اپنا گھر، اپنی منزل، پاس کھڑے جے دیو کا دل دھڑک رہا تھا ـــــ انگلیاں گھر تلاش کریں گی؛ گھر..... میراں گھر..... وہ.......

قینچی کی نوک جے دیو کو چبھی وہ سنبھل گیا۔ خیالات کا سلسلہ اس طرح منتشر ہو گیا جیسے حروف کی سطر کمپوزیٹر کے ہاتھ سے چھوٹ کر منتشر ہو جاتی ہے۔ میزِ ایکسپیرینٹ کھیل تھا۔ زندگی بھی ایک کھیل ہے، لیکن اس سے بہت بڑا کھیل۔ کہانی بھی تو ایک کھیل ہوتا ہے، اور اس کا یہ کھیل بھی شاید ایک کہانی تھا ـــــ جے دیو کو یاد آیا..... جب اُس نے اپنے اس کھیل کا ذکر اپنے ایک دوست سے کیا تھا تو اس نے پہلی بات یہی کہی تھی۔ "کتنی خوبصورت کہانی ہے۔ میں ایک کہانی لکھوں گا۔" قدرت بھی شاید افسانہ نگار کی طرح بے درد ہوتی ہے۔ کسی کا ٹوٹا ہوا کھیل اس کی کہانی بن سکتا ہے، ایک خوبصورت کہانی ـــــ قدرت نے میرا اور تجھے کے کھیل کو شاید اسی لئے توڑا ہو، کیونکہ قدرت بھی تو ایک افسانہ نگار ہے، اور درد افسانے کی روح ہوتا ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی

جے دیو کو خیال آیا، بیچارہ افسانہ نگار ـــــ وہ اپنے کھیل بھی تو افسانے بناتا رہتا ہے۔ آرٹ، آرٹسٹ کا اپنے آپ کو قتل دینا ہی تو ہوتا ہے۔

کاریگر نے ساٹن کے کٹے ہوئے ٹکڑوں کو۔ مارکیٹ کے نئے ڈیزائن کو ـــــ مشین کی سوئی کی نوکوں کے نیچے سے گذارنے کے لئے جے دیو کے ہاتھ سے لے لیا۔ یوں اچھی طرح کاٹ کیا ہوا کپڑا کس کام اگر وہ سوئی کی نوکیں چبھوا چبھوا کر تیار نہ ہوا..... جے دیو کو یاد آیا اس کے ایک دوست نے کہا تھا: "محبت اچھی کاٹ کی طرح ہی ہوتی ہے۔ اور جب وہ فرقت کی تیز نوکیں چبھوا چبھوا کر تیار ہو تو وہ مارکیٹ کے اس نئے ڈیزائن کی طرح آرٹ بنتی ہے۔" شعرا بھی تو کہتے ہیں: "محبت اور فرقت کا جب ملاپ ہوا شاعری نے جنم لیا۔"

آرٹ، آرٹ ہے۔ چاہے شاعری ہو چاہے مصوری اور چاہے کچھ اور۔ اور جے دیو شاعر یا مصور تو نہیں تھا، لیکن درزی بن گیا تھا میراں کے لباس کے نئے اور شوخ ڈیزائنوں نے اُسے یہی بنا دیا تھا، ایم اے پاس درزی، لیکن لڑکیوں کا درزی۔ کیونکہ اسے درزی بنانے والی میراں تھی، یہ بھی تو آخر ایک آرٹ ہی تھا۔

ایک نوجوان اور اس کے ساتھ ایک لڑکی..... شاید اس کی بیوی ہو

..... دکان کی سیڑھیاں چڑھے۔ پاؤں کی آہٹ پر جے دیو نے سر اوپر اٹھایا

"آپ کی سلائی کی بہت تعریف سنی ہے ــــ نمونے کے طور پر یہ آپ سے ایک ... دو قمیص سلوانا چاہتی ہیں ... ناپ لے لیجئے۔" اور نوجوان نے پھولدار کپڑے کے دو ٹکڑے جے دیو کے سامنے رکھ دیئے۔

کپڑے کا فیتہ اٹھا کر لڑکی کے جسم کا ناپ لینے کے لئے جے دیو نے جب آنکھیں لڑکی کی طرف اٹھائیں ..... اُف۔ خدایا! ــــ وہ میراں تھی ..... جے دیو کے سر میں چکر سا آگیا ..... "اصلی بار چھوٹے پتوں میں نہیں ہوتی غلط کھیلنے میں ہوتی ہے۔" جے دیو کے دماغ نے سمجھایا۔ اور اس نے لرزتے ہوئے بازوؤں کے ساتھ فیتہ اس کی چھاتی کے گرد پھیلا دیا۔ میراں ..... اور جے دیو کے بازو، لیکن اس حقیقت میں بھی آج کوئی حقیقت نہیں تھی۔

میراں نے نہ معلوم اُسے پہچانا نہیں تھا، یا شاید وہ اپنے ہم درس جے دیو کو درزی سوچ ہی نہ سکتی تھی، اور کہا نہیں جا سکتا کہ کیوں، لیکن وہ بولی بالکل نہیں ..... لمبائی، کمر، چھاتی، کندھے، بازو ..... سب کچھ وہ ناپ چکا تھا ..... "چلو میراں!" "آج کے دن پورے ہفتے کے بعد کپڑے تیار ہوں۔" نوجوان نے پہلی بات لڑکی سے اور دوسری جے دیو سے کہی

میراں اس کے ساتھ چل دی، اس کا دل چاہا کہ ایک مرتبہ کہہ دے "ٹھیرو میراں"! جس طرح اس کے شوہر نے کہا تھا: "چلو میراں" لیکن وہ تو میراں سے چلنے کو کہہ سکتا تھا۔ کیونکہ اُسے میراں کے لئے قمیص خریدنے اور سلوانے کا حق حاصل تھا۔ لیکن یہ کیونکر میراں سے ٹھیرنے کو کہہ سکتا تھا۔ اس نے تو اجرت لے کر اس کی قمیص کی سلائی کرنا تھا۔

چلتی گاڑی میں

وسل سنائی دیا اور گاڑی ایک ہلکے سے ہچکولے کے ساتھ روانہ ہوئی۔ ایک مسافر نے بھاگتے ہوئے گاڑی کے آخری ڈبے کی سلاخ پر ہاتھ ڈالا۔ قلی نے کھڑکی کی راہ سے چھوٹا سا اٹیچی کیس کمرے کے اندر پھینک دیا۔ جو کھڑکی کے قریب بیٹھے ہوئے ادھیڑ عمر کے ایک مسافر کے کندھے کو چھو کر سیٹ پر جا گرا۔ قلیوں کی سرخ قمیضوں پر پیتل کے چمکتے ہوئے نمبر نظروں سے اوجھل ہو گئے۔ ہندو پانی، مسلمان روٹی، آلو چھولے، گرما گرم پوری کی آوازیں گاڑی کی کھڑکھڑاہٹ میں گم ہو گئیں۔

"چلتی گاڑی میں سوار ہونا بھی بھلا کوئی تُکی ہے؟" ڈبے میں بیٹھے کسی مسافر نے کہا۔

"یہ بھی آج کل کا فیشن ہے جناب فیشن۔" دوسرے نے جواب دیا۔

"جوانی مستانی ہوتی ہے بھائی صاحب! آپ کیا جانیں۔" تیسرا بول اٹھا۔

نوجوان دونوں ہاتھوں میں سیٹ تھامے کمرے میں چاروں طرف دیکھنے لگا۔ دوسری طرف کی سیٹ پر ایک نوجوان لڑکی بیٹھی تھی۔ باقی جگہ خالی پڑی تھی۔ سامنے کی سیٹ پر پانچ چھ دیہاتی عورتیں ایک دوسرے میں گھسی نہایت تنگی کے ساتھ بیٹھی تھیں۔ گویا وہ لڑکی کی ملائم ریشمی ساڑھی کے ساتھ اپنے گاڑھے کے کھردرے کپڑوں کا جوڑ نہ دیکھ کر ایک طرف ہٹ کے بیٹھ گئی تھیں۔ لڑکی کے ہاتھ میں ایک باتصویر رسالہ تھا۔ اور ان عورتوں کے ہاتھوں میں دُبلے پتلے اور رونی صورتوں والے بچے تھے۔ کمرے کے اندر داخل ہونے والا نوجوان لڑکی والی خالی سیٹ کی طرف چلا گیا۔

"کیا میں یہاں بیٹھ سکتا ہوں؟" ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ اس نے لڑکی سے دریافت کیا۔

"ہاں ہاں بیٹھ جائیے۔" لڑکی نے رسالے سے نگاہ اٹھا کر جواب دیا۔

"تھینک یو۔" کہہ کر اپنا اٹیچی کیس اور سیٹ ایک طرف رکھتے ہوئے بولا "میں تو ٹرین مس کرنے کو تھا۔"

"ہاں! آپ عین وقت پر پہنچے۔"

"سچ مچ عین وقت پر۔" اور نوجوان نے لڑکی کی طرف نظر بھر کر دیکھا۔

ہوا کا ایک جھونکا آیا، لڑکی کی ساڑھی کا پلو سر سے سرک گیا، اس نے رسالہ ہاتھ سے رکھ دیا اور اپنے بال درست کرنے لگی۔

"کیا میں اسے دیکھ سکتا ہوں؟" نوجوان نے رسالہ میں لڑکی کے پوروں کی لمس محسوس کرتے ہوئے رسالہ آہستہ سے اٹھا لیا۔ کھڑکی کے پاس بیٹھے ہوئے مسافر کے کندھوں میں یوں جنبش ہوئی گویا وہ اب بھی اٹیچی کیس کی لمس محسوس کر رہا تھا۔ حقے کی نے منہ میں لئے ایک بوڑھا نہایت غور سے ان دونوں کی طرف تاک رہا تھا۔

نوجوان رسالے میں ایک سینما کا اشتہار پڑھتے ہوئے بولا "اچھا! تو آپ بھی پکچرز میں انٹرسٹڈ ہیں؟ مجھے تو بے حد شوق ہے۔ اگر کسی دن میں اتفاق سے سینما شو مس کر دوں تو مجھے کھانا ہضم نہیں ہوتا۔"

لڑکی ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ کھڑکی سے باہر دیکھنے لگی۔

"آپ نے 'چاندنی' دیکھا ہے؟" اس نے لڑکی کو پھر مخاطب کیا۔

"چاندنی؟ ..... چاندنی کونسا کھیل تھا؟ ہاں ہاں یاد آ گیا جس میں خورشید نے ہیروئن کا کردار ادا کیا ہے۔ ہاں میں نے دیکھا ہے۔"

"تو گویا آپ کو بھی خورشید کی اداکاری پسند ہے" نوجوان نے ذرا دلچسپی کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

"ہاں وہ گا اچھا سکتی ہے۔"

"اُف! اور اس کا ایکٹنگ" نوجوان کی آنکھیں جھومنے لگیں "اس کی آنکھوں کے اندر ٹریجڈی ہے، وہ تو میری فیورٹ فلم سٹار ہے۔ ـــــ گیت ..... اس کے گیت ...... بادِ نسیم کی سرسر کی طرح ہر وقت کانوں میں ایک خوشگوار گونج پیدا کرتے رہتے ہیں" اور نوجوان آہستہ آہستہ گنگنانے لگا۔

"پہلے جو محبت سے انکار کیا ہوتا"

گانے کے ساتھ تال دیتے ہوئے نوجوان کے پاؤں سیٹ کے نیچے رکھی وائلن کے ساتھ جا ٹکرائے۔

"اُف۔ میری وائلن" اور لڑکی نے گھبرا کر سیٹ کے نیچے جھانکا۔

"ویری سوری" نوجوان نے کیس سیٹ کے نیچے سے نکال لیا "دیکھیں کوئی ضرب تو نہیں آئی؟"

"نہیں نہیں کوئی بات نہیں" لڑکی نے وائلن کو اوپر نیچے سے دیکھتے ہوئے جواب دیا۔

"یہ ساز تو ہے بھی بالکل لڑکیوں کے لائق، ہاتھ میں پکڑا ہوا بھی کتنا فائن معلوم ہوتا ہے۔"

"ستار وغیرہ کا تو سفر میں لے جانا بھی مشکل ہوتا ہے۔"

"اجی ستار کا اور اس کا بھلا کیا مقابلہ۔ یہ تو ایک فائن چیز ہے۔"

"نہیں! مجھے تو بلکہ ستار زیادہ پسند ہے صرف سفر کے خیال سے......"

"ہاں ہے تو وہ بھی ایک شاندار چیز۔ سماں باندھ دیتی ہے۔" اجالا میں پرتھوی راج نے اس غضب کا ستار بجایا تھا کہ نسیم کو پاگل ہو کے اس کے پاس آنا پڑا تھا ——— میرا مطلب صرف یہ تھا ——— ہاں میرا ——— مطلب تھا کہ......"

"ساز ہر ایک دلکش ہو سکتا ہے۔ بشرطیکہ سازندہ......" لڑکی مسکرا دی۔

"درست ہے۔ ایک اچھا سازندہ...... خواہ کوئی بھی ساز ہو اس کے اندر جان ڈال سکتا ہے۔ نسیم ساز کی گت پر متوالی ہو کر آئی تھی۔ آپ نے نسیم کا رقص پسند کیا تھا؟"

"کیوں نہیں۔"

"تو گویا آپ رقص میں بھی انٹرسٹ لیتی ہیں۔ ضرور لینا چاہئے۔ یہ بھی تو ایک آرٹ ہے ہندوستان کا قدیم آرٹ۔ پنجاب میں کم ہی لڑکیاں اس آرٹ کی قدر کرتی ہیں۔ آپ سے مل کر مجھے بہت مسرت ہوئی ہے۔ میرا خیال ہے آپ تو رقص میں بھی خوب ماہر ہوں گی۔"

"جی نہیں۔ میں رقص کرنا نہیں جانتی۔"

"خیر چیز کو دیکھنا اور ایپریشیئیٹ کر سکنا بھی تو بجائے خود ایک آرٹ ہے۔" یہ کہہ کر نوجوان لڑکی کی طرف نہایت للچائی ہوئی نظروں سے دیکھنے لگا۔

اتنے میں سٹیشن آ گیا، گاڑی رک گئی۔ مسافروں کا شور، قلی قلی کی آوازیں، خوانچے والوں کے عجیب و غریب آوازے، خاموش فضا میں ارتعاش سا پیدا ہو گیا۔

"اُف! کس قدر شور ہے۔ بالکل وحشی لوگ ہیں۔ ابھی تک اتنی بھی تمیز نہیں آئی کہ کس طرح سوار ہونا ہے اور کس طرح اترنا ہے۔"

"برف سوڈا، سوڈا برف۔" آواز آئی۔

"او بھائی! ادھر آؤ۔"

"جی حضور! سوڈے والا کھڑکی کے پاس آ کھڑا ہوا۔

"دیکھو دو لیمونیڈ۔ خوب ٹھنڈا ہو ——— جلدی لاؤ، بہت جلدی، سنو کیا تک رہا ہے نان سینس؟"

"مجھے تو پیاس نہیں۔ آپ اپنے لئے منگا لیں۔" لڑکی نے کہا۔

"پیاس کیسے نہیں؟ کیا آپ اسے برا سمجھتی ہیں؟ میرا خیال ہے آپ جیسی ایجوکیٹڈ لڑکی کو اس قسم کی فرینڈشپ پر اعتراض نہیں ہونا چاہئے۔"

"نہیں نہیں ——— مجھے چنداں پیاس نہیں تھی ——— ورنہ میرا تو بلکہ یہ خیال ہے کہ ہمارے ملک کے مردوں کی کمزوری کی وجہ ہی یہ ہے کہ ان کی زندگی عورت کے اشتراک سے بالکل کٹ آف ہو گئی ہے۔"

دو گلاس لیمونیڈ کے آجاتے ہیں۔ لڑکی کو گلاس پکڑاتے وقت سوڈے والے کو کسی کا دھکا لگتا ہے، اور تھوڑا سا پانی لڑکی کی ساڑی پر گر جاتا ہے۔

"ڈیم فول! دکھائی نہیں دیتا کیا۔ گدھا کہیں کا۔" یہ کہہ کر نوجوان اپنے ریشمی رومال سے لڑکی کی ساڑی پر گرا ہوا پانی پونچھنے لگتا ہے۔ اتنے میں کمرے کے اندر ایک جوڑا داخل ہوتا ہے۔ مرد ادھیڑ عمر کا معمولی سادہ کپڑے، لیکن لڑکی کے کپڑے رنگا رنگ کے بھڑکیلے اور شوخ ہیں۔

"نہ معلوم کیوں، بیشتر لڑکیوں کو کپڑے پہننے کا بھی شعور نہیں۔ ان کی رنگ کی چوائس اُف توبہ۔ سرخ کے ساتھ نیلا، گلابی کے ساتھ فیروزی۔ .... کالا پیلا اور کیا کیا واہیات کمبی نیشن دیکھنے میں آتے ہیں۔" نوجوان نے طنزاً کہا۔

"ہاں سلیقہ امارت پر منحصر نہیں، پھر بھی اپنی اپنی پسند ہے۔ کسی کو شوخ رنگ اچھے لگتے ہیں کسی کو ہلکے۔"

"آپ کی ساڑی کا رنگ کتنا دیدہ زیب ہے۔"

"مجھے تو زیادہ تر سفید کپڑے ہی پسند آتے ہیں۔" لڑکی نے ذرا جھجک کر کہا۔

"ہنسوں کی طرح سفید۔" نوجوان نے ہنس کر جواب دیا۔

"سفید تو خیر بگلے بھی ہو سکتے ہیں۔" اور لڑکی بھی ہنسنے لگی۔ کمرے میں بیٹھے دو تین آدمیوں نے اپنے ہونٹ سکیڑ لئے۔

"ہاں ——— یہ تو میں نے پوچھا ہی نہیں کہ آپ تشریف کہاں لے جا رہی ہیں؟"

دوسرا اسٹیشن آگیا اور بات چیت وہیں رک گئی۔ گاڑی چلنے پر نوجوان بولا۔

"ہاں! تو میں دریافت کر رہا تھا آپ کہاں جا رہی ہیں؟"

"لاہور۔"

"گڈ لک ——— میں بھی لاہور جا رہا ہوں۔ مجھے لاہور بہت پسند ہے۔ ہوٹل، سینما اور دوسری کئی قسم کی اینٹرٹینمنٹس۔ لیکن ایک بات ہے، وہاں مکان تلاش کرنے میں بہت دقت پیش آتی ہے۔ کالج لائف میں تو بہت لطف رہا۔ پھر مجھے سروس بھی لاہور ہی میں مل گئی، ——— لیکن مکان کے متعلق بہت پریشان ہونا پڑا۔"

"کیوں مکان کیوں نہیں ملتا؟"

"نہ معلوم کیوں۔ شاید لوگ سمجھتے ہیں کہ بیوی بچوں کے بغیر مکان میں رہنے کا کسی کو حق نہیں۔" نوجوان کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ آگئی۔

"ہاں! مالک مکان ذرا اعتراض کرتے ہی ہیں۔ لیکن آپ نے تو بیوی کے ساتھ ہی رہنا تھا؟"

"بیوی! لیکن جس نے ابھی یہ تجربہ کیا ہی نہ ہو وہ کیا کرے، دراصل میں چاہتا تھا کہ اپنی ایجوکیشن ختم کر کے کہیں شادی وغیرہ کا خیال کروں گا۔ ورنہ شادی ایک وبال جان بن جاتی ہے۔"

"درست ہے جب تک آدمی اپنے پاؤں پر کھڑا نہ ہو جائے۔ اس وقت تک اسے کوئی ذمہ داری اپنے اوپر نہیں لینی چاہیئے۔"

"بجا فرمایا آپ نے۔ آپ تو بالکل میری ہم خیال نکلیں۔ میں چاہتا تھا کہ ایجوکیشن ختم کر کے اپنا کمپینین خود انتخاب کروں۔"

"ہاں! جسے ذرا بھی سمجھ ہو وہ یہی سوچے گا۔"

"یہی تو ایجوکیشن کا فائدہ ہے۔ ورنہ دیہات میں تو پندرہ پندرہ سال کی لڑکیاں دو دو بچوں کی مائیں بھی بن چکی ہوتی ہیں۔ آپ لاہور میں تعلیم حاصل کر رہی ہونگی؟ بورڈنگ میں رہتی ہیں؟"

"جی نہیں۔ تعلیم تو میں پچھلے سال سے ختم کر چکی ہوں۔ اس کے بعد پتاجی نے ....." لڑکی ذرا شرما سی گئی۔

"ہاں! والدین کے اپنے اپنے خیالات ہوتے ہیں۔ انہوں نے آپ کا سلسلہ تعلیم جاری رکھنا پسند نہ کیا ہوگا۔"

"نہیں ——— پسند تو کرتے تھے ——— لیکن....."

"ہاں! بعض اوقات زندگی کے سرکم سٹانسز اجازت نہیں دیتے۔"

ایک سیٹ چھوڑ کر دوسری پر ایک بچہ نہایت زور زور سے رونے لگا تھا۔ کیونکہ دوسرے بچے نے اس کے ہاتھ سے ربڑ کی گڑیا چھین لی تھی۔ چار پانچ بچوں میں گھری ہوئی بیچاری ماں جھنجھلا اٹھی۔

"معلوم نہیں، ہمارے لوگ اپنی آبادی اس سرعت کے ساتھ بڑھائے کیوں جا رہے ہیں۔ مجھے تو یہ بچے وچے قطعاً پسند نہیں۔ عورت کی آزادی میں یہ سب سے بڑی روکاوٹ بن جاتے ہیں ——— میرا خیال ہے آپ بھی ناپسند کرتی ہونگی؟"

"مجھے تو اچھے لگتے ہیں۔" لڑکی نے ہنس کر جواب دیا۔ "ہاں البتہ زور بچنا چاہیئے لیکن جہاں تک والدین بچوں کی ذمہ داری پورے طور پر نبھا سکیں۔ زیادہ اولاد ہو تو ماں باپ نہ تو بچوں کی اچھی پرورش کر سکتے ہیں۔ اور نہ انہیں مناسب ایجوکیشن دے سکتے ہیں۔"

"میرے کہنے کا بھی یہی مطلب تھا۔"

"ویسے تو مجھے بھی اچھے لگتے ہیں۔" نوجوان نے تھوڑے وقفے کے

جد کہا۔

"اب تو لاہور بالکل قریب ہے۔"

"واہ! مجھے تو خیال ہی نہیں رہا کہ اتنا وقت گذر گیا ہوگا۔ آپکی کمپنی نے سفر نہایت ایزی کر دیا۔ وقت کٹنا معلوم ہی نہیں ہوا۔"

"شکریہ" لڑکی نے مسکرا کر کہا۔

"امید ہے لاہور پہنچنے پر آپ یہ ملاقات ادھوری نہیں چھوڑ دیں گی۔"

یہ کہتے ہوئے نوجوان کے چہرے پر قدرے گھبراہٹ کے آثار تھے۔

"آئی سی ـــ فرینڈ شپ اچھی چیز ہے۔ آپ کا ایڈریس؟ ـــ آپ کا نام تو میں نے پوچھا ہی نہیں۔"

"مجھے 'چھایا' کہتے ہیں۔ اُف کس قدر بھیڑ ہے۔" لڑکی کھڑکی سے باہر جھانکنے لگی۔ "پلیٹ فارم پر تو تل دھرنے کو جگہ نہیں ـــ آپ کا اسم شریف؟"

"ہم فیروز پور روڈ پر ۔۔۔۔ مسٹر کرشن چندر ایم اے ۔۔۔۔"

"خادم کا نام ستیش ہے ۔۔۔۔ یہ لیجئے میرا کارڈ" نوجوان نے جیب سے وزیٹنگ کارڈ نکالتے ہوئے کہا۔

گاڑی آہستہ ہو گئی۔ لاہور سٹیشن سے جم غفیر کی طرح طرح کی آوازیں آنے لگیں، چھایا کھڑکی سے باہر جھانک کر بول اٹھی۔

"وہ، وہ تشریف لے آئے ہیں۔ مجھے معلوم تھا ضرور مجھے لینے آئینگے۔"

"کون؟ کوئی آپ کو لینے آئے ہیں کیا؟"

"جی ہاں ۔۔۔۔ میرے ۔۔۔۔" اور چھایا کھڑکی میں سے پلیٹ فارم پر کھڑے نوجوان کی طرف ہاتھ ہلانے لگی۔

ستیش نے پلیٹ فارم والے نوجوان کی طرف دیکھا۔ اور پھر گھبرا کر لڑکی سے پوچھا: "کیا آپ اپنی شادی کا فیصلہ کر چکی ہیں؟"

"فیصلہ کیوں؟ شادی بھی ـــ ابھی تو میں نے آپ کو بتایا تھا۔ مسٹر کرشن چندر ایم اے فیروز پور روڈ ـــ یہ میرے پتی کرشن چندر ـــ ہاں تو آپ کا کارڈ؟"

گاڑی ٹھہر گئی۔ کرشن چندر نے چھایا کا ہاتھ نہایت محبت سے پکڑ لیا۔ چھایا نے پتی کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں دبا لیا۔ ستیش کو یوں معلوم ہوا گویا اس کا سر چکرا رہا ہے۔ شاید گاڑی کے یکدم رکنے سے جو دھکا لگا تھا، اس کی وجہ سے یا ـــ نہ معلوم کیوں؟ اُس کا ہاتھ کانپ گیا۔ اور انگلیوں میں پکڑا ہوا کارڈ پھسل کر زمین پر آ رہا۔

مسکراہٹ

بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ انسان اپنی کوئی شے اگر کسی کو دے بیٹھے، تو پھر ضرورت پڑنے پر اُسے اس شے کے لئے اُسی شخص کا دست نگر ہونا پڑتا ہے، جسے اُس نے وہ خود دی تھی جس طرح بعض والدین اپنا اثاثہ اولاد کے حوالے کر کے تاحیات نان نفقہ کے لئے اپنے اُن بچوں کے محتاج ہو جاتے ہیں جو پہلے اپنی ہر ضرورت کے لئے اُنکے آگے اپنے ہاتھ پھیلایا کرتے تھے۔

عین یہی حالت نیلا کی ہوئی جب نیلا نے پہلی مرتبہ اُسے دیکھا نہ معلوم اُس میں کیا تھا، دیکھتے ہی نیلا کے دل کے اندر کچھ اس طرح محسوس ہوا جیسے سمندر کی لہریں ٹھاٹھیں مار رہی ہوں۔ اور وہ ان لہروں کو اپنے ہی

دل کی گہرائیوں میں جذب کر لینا چاہتی ہو۔ لیکن اُس کی کرنیں بھی تو چاند سے کم نہیں تھیں۔ اور وہ چاند کی کرنوں کو اپنی لہروں کا اچھالا دے چکی تھی، اور اب وہی اچھالا جوار بھاٹے کی صورت اختیار کئے بغیر واپس نہیں ہو سکتا تھا

ایک دن نیلا صوفے پر بیٹھی تھی تقریباً ایک بجنے کا وقت ہو گا، خبروں کے بعد ریڈیو پر دوپہر کے ریکارڈ بجنے شروع ہوئے تو ایک ریکارڈ کی غزل کا پہلا مصرعہ یہ تھا۔ ع

چھلکنے لگا اب تو جام محبت

اس نے نیلا سے کہا کچھ نہیں، صرف اُس کی طرف دیکھا، لیکن اُس کی نگاہ میں کوئی ایسی لمس تھی جس سے نیلا کو اپنا جام چھلکتا ہوا نہیں، بلکہ لبالب بھر کے فرش پر گرتا ہوا محسوس ہوا۔

اگر کوئی آدمی خود ہی جلاوطن ہونا چاہے تو اس کی اپیل بھلا کہاں ہو سکتی ہے۔ نیلا کا دل بھی تو از خود اپنا وطن چھوڑ رہا تھا۔

"نیلا مجھے تم سے کچھ کہنا ہے" اس نے ایک دن نیلا سے کہا۔ نیلا ستار کی ان خوابیدہ تاروں کی طرح تھی جن کے نغمے کسی مضراب کی ایک ہی لمس کے محتاج ہوتے ہیں۔

"نیلا مجھے تم سے کچھ کہنا ہے" اور اُس دن اس نے کچھ کہہ کے نیلا کی خوابیدہ تاروں کو چھیڑ ہی دیا۔ محبت کا خفتہ نغمہ بیدار ہو اٹھا۔ جس کا

شاید تاروں کو بھی علم نہیں تھا، کہ وہ ان کے اندر مستِ خواب ہے۔

نیلا نے ہمیشہ اُس کے چہرے پر ایک مسکراہٹ دیکھی، بھیروں کے راگ کی طرح جسے جب بھی گاؤ بھلا لگتا ہے۔ اُس کی دائمی مسکراہٹ نیلا کے دل کی پہنائیوں میں اُتر جاتی تھی۔

"آپ کیونکر خوش رہ سکتے ہیں؟...... میں تو بہت اُداس ہو جاتی ہوں" نیلا نے اُس سے پوچھا۔

"کیا فائدہ اُداس ہونے کا" اس نے مسکرا کے کہا۔

نیلا خوفزدہ ہو گئی۔ مبادا محبت میں کوئی کسر رہ گئی ہو۔ اس نے دل کی بے چینی ضبط کرتے ہوئے دریافت کیا۔

"آپ کا دل نہیں چاہتا کہ میں آپ ہی کے پاس بیٹھی رہوں؟"

"کیوں نہیں، اگر میرا بس چلے تو ۲۴ گھنٹے تمہیں اپنے پاس بٹھائے رکھوں"

یہ سُن کر نیلا کو محسوس ہوا کہ اس کی محبت مکمل ہے، پراثر ہے۔

"لیکن جب یہ ممکن ہی نہ ہو...... تو......" وہ پھر مسکرایا۔

نیلا نے سوچا نہ معلوم وہ کس قسم کا انسان ہے۔ جو مسکرا کے مل سکتا تھا۔ جس کی ہنسی بھی تبسم خیز تھی اور جس کے آنسو بھی مسکراتے تھے۔ نیلا کے آنسو دیکھ کے وہ کہا کرتا تھا "یہ بچوں کی سی باتیں ہیں" اور پھر مسکرا دیتا تھا "یہ اداس سا چہرہ نہ بنایا کرو" وہ کہا کرتا تھا "ڈارلنگ، جیسے

تم ہنستی ہو مجھے بہت اچھی لگتی ہو" اور نیلا بھی صرف اسے اچھی ہی لگنا چاہتی تھی۔ اس کے بعد نیلا نے اس کی آنکھوں کے سامنے صرف اپنی ہنسی ہی پیش کی۔

نیلا گایا کرتی تھی، اور کبھی کبھی وہ سٹیج پر بھی گا دیا کرتی تھی۔ کیونکہ وہ جانتی تھی کہ اُس کے گیت اور اس کے گانے کی تعریف اسے اُس کی نظروں میں اور بھی اچھا بنا دیتی تھی، جو نیلا اُسے اچھا لگنے کیلئے اپنے آنسو چھپا سکتی تھی۔

اور اس نے اُس دن بھی سٹیج پر گانا منظور کر لیا۔ کیونکہ اُسے معلوم تھا کہ وہ بھی وہاں آئے گا۔ نیلا کو اس گیت میں کوئی جادو سا محسوس ہوتا تھا۔ اس لئے اس نے دہرایا ؏

"چھلکنے لگا اب تو جامِ محبت"

سٹیج پر گاتے ہوئے نیلا نے مقابل کی کرسیوں پر نگاہ ڈالی، اُس وقت وہ اپنے سے تیسری کرسی پر بیٹھی ہوئی کسی دوشیزہ کی طرف اُسی نظر سے دیکھ رہا تھا۔ جس نظر کی لمس سے کبھی نیلا کو محسوس ہوا تھا۔ کہ اُس کا جام چھلک کے فرش پر گرتا جا رہا ہے...... اور وہ لڑکی نیلا کی سہیلی تھی۔ نیلا کا جام...... نیلا کا دل...... نیلا کی آنکھیں......
...سب کچھ چھلکنے پر آ رہا تھا۔

جب وہ گا چکی، سٹیج سے نیچے اُتری، وہ اپنی کرسی سے اٹھ بیٹھا اُس کے چہرے پر وہی مسکراہٹ تھی۔ اس نے نیلا کے گانے کی داد دی۔ اُس سے تیسری کرسی پر بیٹھی ہوئی لڑکی نے کہا "آپ نیلا کو پہلے ہی جانتے ہیں کیا؟ یہ میری سہیلی نیلا"

جواب میں وہ مسکرا دیا۔ وہی مسکراہٹ، بھیروں کے راگ کی طرح جسے جس وقت بھی گاؤ بھلا لگتا ہے۔

نیلا کو یاد آگیا، اس کی سہیلی نے اسے کہا تھا کل وہ جلسے میں آ رہے ہیں "وہ" دکھانے گی۔ نیلا کا جام..... نیلا کا دل..... نیلا کی آنکھیں سب کچھ چھلکنے پر آگیا "ڈارلنگ، جب تم ہنستی ہو مجھے بہت اچھی لگتی ہو" نیلا کو یاد آگیا۔ اور اُس نے اپنے چھلکتے ہوئے جام، چھلکتے ہوئے دل اور چھلکتی ہوئی آنکھوں کو مسکراہٹ میں تبدیل کرنے کی کوشش کی۔

دوسرے پل وہ بے ہوش تھی، اور جب ڈاکٹر نے اسے دیکھا تو پہلی بات یہی پوچھی

"یہ لڑکی بیہوشی میں بھی مسکرا کیوں رہی ہے؟"

ایک رات کی بات ہے

رات کے اندھیرے میں عام طور پر آدمی وہ کچھ کر گذرتا ہے جو دن کی روشنی میں تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ دماغ کا تسلط گویا ڈوبتے سورج کے ساتھ ہی ڈوب جاتا ہے۔ اور دل کی کارفرمائی اسی نسبت سے بڑھنے لگتی ہے، جس نسبت سے چاروں طرف سے اُمڈتی ہوئی تاریکی بڑھتی ہے۔ خدا کا تصور بھی رات ہی کو باندھا جاتا ہے۔ خون بھی راتوں کی گہری تاریکی ہی میں ہوتے ہیں۔ گیتا بھی زیادہ تر رات ہی کو لکھی جاتی ہے اور خودکشی بھی رات ہی کو......!

ایک رات کی بات ہے رج ودیا روتے روتے اپنے چچا کی گود میں گر پڑی "میں آپ سے کچھ کہنا چاہتی ہوں۔ مجھے معلوم نہیں کہ

میں آنکھیں موند کر کسی سے کتنی کتنی دیر تک باتیں کرتی رہتی ہوں — نہ جانے کس سے! اور پھر کتنی ہی باتیں ہیں کسی سے آسمان کی طرف تکتے ہوئے کرتی ہوں — وہ بھی معلوم نہیں کس سے! اور اس کے بعد میں اترے ہوئے سمندر کی طرح تھکی ہاری، ساکت ہو جاتی ہوں۔ لیکن آج میں کسی مرد سے باتیں کرنا چاہتی ہوں — چاہے وہ کوئی ہو اور چچا جی! — اس وقت اور کوئی نہیں آپ ہی ہیں — چلئے آپ ہی سے سہی۔ آپ کو سننا پڑے گا، جو کچھ میں سنانا چاہتی ہوں۔ میرے اندر ایک ہلچل ہے۔ میں نہیں جانتی یہ کہاں سے پیدا ہوتی ہے، کس طرح بڑھتی ہے، اور کس طرح مجھ پر چھا جاتی ہے۔ ایسے عالم میں میرا دل چاہتا ہے کہ میں کچھ کر دوں — کیا کر دوں — یہ نہیں جانتی۔ میں آپ کے خیال میں آپ کے معزز اور شریف گھرانے کی بیٹی ہوں، لیکن جس وقت میرے اندر یہ طوفان اٹھتا ہے، مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ مجھے دنیا کے ذرے ذرے سے نفرت ہے۔ جی چاہتا ہے کہ میں ایک بے نام آندھی بن کر کائنات کے ذرے ذرے کو تباہ کر دوں۔ ایک اندھا طوفان بن جاؤں جو ہر اس چیز کو جو اس کے سامنے آئے توڑ کر رکھ دے۔ ہر بات، ہر کام، ہر چیز کا انگ انگ مجھے دکھتا ہوا محسوس ہوتا ہے — سب سے زیادہ

نفرت میں اس عورت سے کرتی ہوں، جو ساقھ کی عورت کے کان میں ذرا مسکرا کر، ذرا غرور سے، تمسخر بھرے لہجے میں کسی تیسری عورت کی بات کرتی ہے۔ جی چاہتا ہے کہ اسے گولی مار دوں، دھرتی سے آنچل اٹھا کر چلنے والی تمام دھرماتما عورتوں سے مجھے شدید نفرت ہے۔"

راج ودیا نے مٹھیاں بھینچ لیں۔ اس کے چچا نے اس کے ماتھے پر ہاتھ رکھا — اس کا ماتھا گرم ہو رہا تھا۔

"ایک طوائف سے مجھے کبھی نفرت نہیں ہوئی۔ اس کے علاوہ میں سب سے نفرت کرتی ہوں — نفرت! —"

راج ودیا پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی — بے بس سی کونج کی طرح، معصوم فاختہ کی طرح۔

"میں تمام مردوں سے نفرت کرتی ہوں — تمام مردوں سے" یہ عورتوں کو کھلونا سمجھتے ہیں۔ ہم عورتوں کے سامنے محبت کا دکھاوا جہیز کی طرح بکھیر دیتے ہیں — آنسوؤں کے مقناطیسی پتھروں کو سامنے لا کر رنگ برنگی خوشامدوں سے ہماری آنکھوں کو اپنی جانب مائل کرتے ہیں۔ اور پھر جب اپنے ہم جنسوں میں اکٹھے بیٹھتے ہیں تو ہماری محبت کو اپنے ہنسی مذاق کا نشانہ بناتے ہیں، ہمارے دلوں کو جیتنے کی کہانیاں ایک دوسرے کو مزے لے لے کر سناتے

ہیں — بزدل، فریبی — کمینے:

راج ودیا کا انگ انگ جل اٹھا —

میں ہوائی جہاز چلانا چاہتی ہوں — بس یہی کام میرے نزدیک سب سے اچھا ہے۔"

چچاجی کو ایسا محسوس ہوا جیسے راج نے گہرا دو ہتڑ مارا ہے، اور وہ آہستہ آہستہ اس کا سر دبانے لگے —

"میں ایک شریف زادی کی طرح صبح آرام سے اٹھ کر نہا دھو کر، اچھے اچھے کھانے تیار کر کے گھر والوں کو کھلا کر اور شام کو بھائی یا شوہر کے ساتھ سیر کر کے اپنے دن نہیں گزار سکتی۔ اور نہ دو چار بیوقوف بچے پیدا کرنے کے لئے اپنی ساری زندگی برباد کر سکتی ہوں۔ مجھے کچھ کرنا ہے مگر معلوم نہیں — کیا؟ — یا تو میں ہوائی جہاز چلاؤں گی یا ایک خطرناک ڈاکو بنوں گی۔ یا آسمانوں میں پرواز کروں گی، یا سمندر کے اتھاہ پانی میں جہاز چلاؤں گی۔ یا پھر میں شکاری بنوں گی۔ میرے ہاتھ ہر وقت خون میں رنگے رہیں گے۔ اور میں ڈز، ڈز بندوق چلاتی پھروں گی — میرے اندر ایک آگ ہے۔ میں ہر وہ کام کروں گی جس کے متعلق لوگ مجھے کہیں کہ یہ کام تیرے کرنے کا نہیں، اس سے بدنامی ہوتی ہے، یا اس

میں خطرہ ہے — ساری سماج سے الٹ چلنے میں مجھے ایک عجیب سی خوشی محسوس ہوتی ہے۔ کبھی کبھی میرا جی چاہتا ہے کہ خونخوار درندے کی طرح کسی کو زخمی کر دوں — دھوبی کے کپڑے گننے چولہے میں پھونکیں مارنے اور کپڑے پر بیل بوٹے کاڑھنے سے — اُف میرے بھگوان — اف — مجھے کتنی نفرت ہے۔ جی چاہتا ہے کہ دنیا بھر کی ریشم کی گچھیاں آگ میں جھونک دوں؛

راج وِدیا نے دو پٹے کو دانتوں تلے دبا کر پھاڑ ڈالا۔ چچا نے اس کے ہاتھوں کو ہتھیلیوں میں لے کر دبایا اور اسکے پاؤں سہلائے۔

"ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تمہارا ہاضمہ خراب ہو چکا ہے — اور آج رات کا کھانا تمہیں بالکل ہضم نہیں ہوا۔ رات کیا کھایا تھا؟ —

گوشت والے چاول، اروی اور بھیں کے کوفتے — سب کی سب چیزیں ثقیل — ٹھہرو میں تھوڑا سا سوڈا بائی کاربونیٹ گھول کر لاتا ہوں" اور چچا نیچے کے کمرے میں سوڈا لینے چلے گئے۔

ایک خط

میرے بھولے بالم!

پرسوں صبح کا سورج ہم دونوں کو شوہر اور بیوی کی صورت میں دیکھے گا..... والدین یہی چاہتے ہیں ـــــ میں بھی یہی چاہتی ہوں ـــــ اور تم بھی ـــــ یہی چاہتے ہو۔ گھر میں سامان فراہم کیا جا رہا ہے... ... برات کے استقبال کے لئے ـــــ بیاہ کی بیدی کے لئے.... ... اور رخصتی کے لئے۔ مجھے خیال آیا جس طرح کوئی شکاری اپنی چیزیں اچھی طرح ٹٹول کر خریدتا ہے ـــــ اسی طرح، اور پھر مجھے خیال آیا کہ بیاہ شادی کی چیزیں بھی تو شکار ہی کا سامان ہیں۔ ان کے ساتھ بھی تو شکار ہی کھیلا جائے گا۔ سب سے پہلے میں خود شکار بنوں گی۔

ـــــ تمہاری دولت کا۔ کیونکہ میں بننا چاہتی ہوں۔ تمہارا یہ تیر مجھے پیارا ہے۔ اس لئے کہ یہ سونے کا ہے ـــــ تم شکار ہو گے، میرے حسن اور میرے ہنر کے ـــــ یہ بھی سونے کی طرح عزیز تیر ہیں ـــــ اور دنیا شکار بنے گی ایک غلط فہمی کا ـــــ کیونکہ پرسوں صبح کا سورج ہمیں خاوند اور بیوی کی صورت میں دیکھے گا۔

کسی جگہ لکھا تھا، اور میں اس بات کو تسلیم کرتی ہوں کہ اگر کوئی عورت اپنی اصلیت صاف الفاظ میں ظاہر کر دے تو یا تو وہ کسی پہاڑ کی کنج میں بیٹھی دیوی ہو گی یا کسی پست ترین غار میں چھپی ہوئی مجرمہ ـــــ مجھے ڈائری لکھنے کی عادت ہے، اور اگرچہ مجھے معلوم ہے کہ میری ڈائری کسی کی نظر سے نہیں گذرے گی، تا ہم میں ـــــ جذبات کی رو میں بہتے ہوئے بھی ـــــ اس میں وہ کچھ درج نہیں کر سکتی جسے اصلیت کہا جا سکے، اور میرا خیال ہے کہ کوئی بھی عورت نہیں کر سکتی۔ اس کے باوجود میرے بھولے بالم! آج میں تمہیں کچھ لکھ رہی ہوں ـــــ اور میں یہ بھی بتا دوں کہ اگر میں یہ سب کچھ نہ بھی لکھوں، تو بھی جو کچھ میں چاہتی ہوں اس میں کوئی فرق نہیں آ سکتا ـــــ میں چاہتی ہوں ـــــ ایک امیر خاوند اور سوسائٹی میں شہرت۔ اس امارت اور شہرت کے لئے میں اپنا شباب، اپنا حسن اور اپنی محبت قربان کر سکتی ہوں۔

تمہارے ساتھ شادی کرنے سے میری آرزو، میری خواہش، میری تمنا برآئے گی۔ تم امیر ہو ــــ بے حد امیر۔ شہر کی ہر مجلس اور ہر محفل تمہارے بغیر بے رونق اور سُونی ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ چند ماہ پہلے میں کوشش کر کے بھی اُن پارٹیوں کے دعوت نامے حاصل کیا کرتی جن میں تمہیں شامل ہونا ہوتا ــــ کیونکہ تمہاری دولت کا تیر مجھے لگ چکا تھا۔ اور اب میں تمہیں اپنے حسن اور ہنر کے تیروں کا نشانہ بنانا چاہتی تھی مجھے اپنے بے خطا تیروں پر پورا بھروسہ تھا ــــ آخر ہوا بھی وہی ــــ تم نے میرے باپ کے پاس میرے لئے درخواست کی۔ ــــ والدین نے میری رضامندی دریافت کی ــــ رضامندی! ــــ وہ درخواست تو خود میری ہی تخلیق تھی ــــ اس لئے آج سامان فراہم کیا جا رہا ہے ــــ تنکار کا ــــ تمہارے تنکار کا، میرے تنکار کا، اور اس سماج کے تنکار کا، جو تمہیں اور مجھے معیاری جوڑا تصور کرے گا۔

مجھے تمہاری دولت تو عزیز ہے ہی، تمہاری عادات بھی پیاری لگتی ہیں ــــ دھیمی آواز میں بات چیت کرنا، ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ ملنا، آہستہ سے ہاتھ دبانا۔ آگے بڑھ کر دروازہ پہلے کھول دینا۔ احترام کے ساتھ تھوڑا سا جھکنا۔ اور اپنے لباس کی طرف خاص

توجہ دینا ــــ دوسرے کے بالوں کی، ساڑی کی اور بول چال کی تعریف کرنا ــــ ہوشیار مالی سے کمروں کی زیبائش کرانا، اپنے بنگلے کو ہر قسم کے جدید ڈیزائن سے آراستہ کرنا ــــ لیکن میں تمہیں محبت نہیں کرتی ــــ اگر اس حقیقت کا میں اپنے منہ سے اقبال نہ کروں، تو زندگی کے آخری سانس تک تمہیں اپنی مکمل محبت کا یقین دلا سکتی ہوں ــــ ہر ایک عورت روزِ پیدائش ہی سے ایکٹ کرنا جانتی ہے۔

کئی سالوں کی بات ہے ــــ جب میں محبت کی خواستگار تھی ــــ اس وقت میں محبت کو روحانی محبت کے ورق کی طرح چمکدار رنگ کا نام دیا کرتی تھی۔ سنہرے ورق کی طرح چمکتی ہوئی محبت ــــ جو دھیمی سی پھونک سے اڑ سکتا ہے۔ پھٹ سکتا ہے ــــ اور جب میں نے پہلی مرتبہ کسی کی آنکھوں کے اندر جھانکا تھا۔ میرے جسم کے اندر ایک لطیف سی رو دوڑنے لگی تھی۔ میرے دل کے اندر ایک شیریں سی گدگدی پیدا ہوئی تھی۔ میں نے اسے روح کا روح کے ساتھ ملاپ خیال کیا تھا۔ مجھے ایک نشہ سا محسوس ہونے لگا تھا۔ اور میں نے اسے روحانی مستی کا نام دیا تھا۔ اس وقت میں مان گئی تھی کہ انسان کی آنکھوں میں

سے خدا کی ہستی جھلک سکتی ہے۔ اس کے اندر روپ تھا، رس تھا۔ اور میں سمجھی کہ یہی سب کچھ ہے۔ مرد عورت کو گڑیا سمجھ کر اسکے ساتھ کھیلتا ہے۔ مرد ہاتھ بڑھاتا ہے اور عورت دل نذر کر دیتی ہے۔ لیکن مرد نہیں جانتا کہ اگر انتقام لینے کی غرض سے عورت کھیلنے پر اتر آئے تو مرد جب ہاتھ بڑھاتا ہے تو عورت اُس کے ہاتھوں کو کھلونوں کی طرح زمین پر پٹک کر پاؤں میں مسل سکتی ہے —— اگر عورت ذرا ہوشیار ہو تو مرد کا کھیل اُس کے نزدیک بازیچۂ اطفال سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا۔ لیکن مرد چاہے کتنا ہی ہوشیار اور چالاک ہو، عورت کا کھیل اس کے لیئے ہمیشہ حقیقت بنا رہتا ہے۔ ہاں تو اس نے میرے ساتھ کھیل کھیلا تھا، اور میں اپنی شکست کا اعتراف کرتی ہوں، کہ اُس وقت میں ابھی بالکل انجان تھی، اور اُس کے ہاتھوں میں کھیلتی چلی گئی —— اب انتقام کا تقاضا یہی ہے، کہ میں کھیلوں، جی بھر کے کھیلوں، مرد کے دل کے ساتھ، اس کے جذبات کے ساتھ، اس کی دولت کے ساتھ —— یہ کھلونے خریدوں اور توڑ پھوڑ دوں۔ اور خریدوں اور زمین پر پٹک دوں۔ پھر خریدوں اور پاؤں میں مسل دوں۔

اس نے میرے ساتھ شادی نہیں کی تھی —— کیونکہ میں ایک امیر

باپ کی بیٹی نہیں تھی۔ بہت عرصہ گذر چکا ہے، کسی امیر باپ نے اُسے اپنی لڑکی کے لیئے دس ہزار روپے سے خرید لیا تھا۔ اس کے بعد میں نے اپنے اوپر محنت کی۔ میں حسن کی دولت سے مالا مال تو تھی ہی۔ میں نے اس میں ہنر کا اضافہ کیا۔ کئی للچائی ہوئی نظریں میری طرف اٹھیں، کئی مشتاق ہاتھ میری طرف بڑھے، مجھے اُن سے نہ محبت ہوئی اور نہ نفرت۔ کیونکہ وہ تمام مرد مجھے ربڑ کے، موم کے، یا مٹی کے کھلونے معلوم ہوتے تھے۔ پتھر بھی پتھر ہے، اور سونا بھی پتھر، پھر اگر اپنا سر پھوڑنا ہی ہے تو سونے کی دیوار کے ساتھ کیوں نہ پھوڑا جائے، وہ چمکدار تو ہے۔

گذشتہ دیروالی کی بات ہے —— جب ہم دونوں چائے پر بیٹھے تھے، میں نے تمہیں یہ بات سنائی تھی: "ایک لڑکی نہایت حسین ہے۔ اس کے ساتھ کوئی شخص شادی کرنا چاہتا تھا۔ چند دن ہوئے لڑکے کو معلوم ہو گیا کہ وہ حسینہ اگرچہ دوشیزہ ہے، لیکن اس کی محبت دوشیزہ نہیں —— لڑکے کو اب کیا طرزِ عمل اختیار کرنا چاہیئے۔ ویسے لڑکی اُسے بیحد پسند ہے۔" اور تم نے اپنی حسب معمول ہلکی سی مسکراہٹ کیساتھ جواب دیا تھا: "اگر لڑکی اسے اتنی ہی پسند ہے جتنی تم مجھے ہو، تو خواہ وہ طوائف بھی کیوں نہ رہ چکی ہو اُسے شادی کر لینی چاہیئے۔" یاد ہے تمہیں، ہیرے

ہونے والے شوہر! اس پر میں ہنس دی تھی۔ تم بھی میرے ساتھ کھیل رہے ہو، میں بھی تمہارے ساتھ کھیل رہی ہوں —— حسن اور عشق اگر یکجا نہیں ہوئے تو حسن اور دولت تو ہو ہی جائیں گے۔ اس لئے ٹھیک ہے۔ اور میں اب چاہتی بھی یہی کچھ تھی۔

میں تمہیں یقین دلاتی ہوں کہ:-

تمہارا گھر پھولوں کی مہک سے لبریز ہوگا۔ اس کے اندر میں کوئل بن کے سنگیت بھر دوں گی، حسن بکھیر دوں گی، مسکراہٹ پھیلا دوں گی۔ تمہارے دوست تم پر رشک کریں گے۔ تمہارے مہمان میرے ہاتھوں کے پکے ہوئے کھانے تم سے مانگیں گے۔ تمہارے لئے ایک پرسکون اور مطمئن گھر بناؤں گی۔ اگرچہ اب مجھے بیوی اور ماں بننے سے نفرت ہے، لیکن میں تمہاری ایسی بیوی اور تمہارے بچوں کی ایسی ماں بنوں گی کہ دنیا مجھے ایک قابل رشک بیوی اور نہایت سیانی ماں سمجھے گی۔

اور رات کو جب لوگ سو رہے ہونگے، میں اُن لوگوں پر ہنسا کروں گی۔

جس طرح رات کے وقت تارے دنیا کے گناہوں پر ہنستے ہیں۔

بس ایک آخری بات —— تم سوچو گے کہ جب میں مرد کے دل اور اس کی دولت کے ساتھ کھیلنا ہی چاہتی ہوں تو پھر شادی سے ایک روز پہلے اپنے ماضی کا، اُسے فرض، تلافی، کفارہ یا اپنے

صاف دل کا بیان سمجھ کر، یوں اقبال کرنا کیوں ضروری تھا؟ میرے بھولے بالم! میں ایک مرتبہ پھر کہوں مرد عورت کو کبھی بھی سمجھ نہ سکے گا۔

یہ سب کچھ بتانا میں فرض نہیں سمجھ رہی، لیکن ہاتھ میں چراغ لے کے چوری کرنا —— اس میں بھی کوئی لطف ہے —— ورنہ تاریکی کے پردے میں گناہ تو ساری دنیا کرتی ہے۔

تمہاری اپنی

......

رات اُسی طرح تیرہ و تار تھی

رات نہایت تاریک اور سیاہ تھی: "میں آج تمہیں دیکھوں گا۔ ضرور دیکھوں گا، تمہیں دیکھے بغیر تو میں مر بھی نہیں سکتا۔" اُسے یوں محسوس ہوا جیسے وہ دیوار کے پار چھوٹے سے باغیچے کے اُس طرف ایک خوابگاہ میں، ساٹن کی ایک نرم سی رضائی کے اندر مستِ خواب نینا کی بند پلکوں کے اندر سوئی ہوئی آنکھوں کو دیکھ رہا ہے۔ دیوار چھوٹی سی تھی، وہ پھاند گیا۔ نرم نرم گھاس پر پاؤں کی آواز کو ہوا نے زیادہ دور نہ جانے دیا اور وہ اپنی نینا کی خوابگاہ کے قریب پہنچ گیا۔ "نینا! تم نے مجھے کبھی محبت نہیں کی، اور یہ جانتے ہوئے بھی میں تم سے محبت کرتا ہوں۔ میں تمہیں ہمیشہ محبت کرتا ہوں، اور تم نے یہ جانتے ہوئے بھی مجھے

کبھی پیار نہیں کیا:" اسے ہنسی آگئی، لیکن اس کی ہنسی میں درد اس طرح مدغم تھا جس طرح چاند کے اندر داغ: "اچھا جس طرح تمہیں یہ حق حاصل ہے کہ تم مجھ سے محبت نہ کرو، اُسی طرح مجھے بھی حق ہے کہ تم سے محبت کر سکوں۔" اُس نے کمرے کی دیوار کے ساتھ اپنا سر لگا دیا۔ دیوار پر سفیدی ہوئی تھی۔ اس سفیدی پر اسکے سر کے منتشر بالوں کے سائے اس طرح دکھائی دے رہے تھے جس طرح بادلوں سے گھرے ہوئے آسمان میں طلوعِ آفتاب کی مدھم شعاعیں دکھائی دیتی ہیں۔ کھڑکی کی راہ سے وہ کمرے کے اندر چلا گیا۔ کمرے میں دو پلنگ بچھے ہوئے تھے، اور سارے کمرے میں ایک چھوٹے سے سبز بلب کی ہلکی ہلکی روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ اس کا سانس اتنا تیز تیز چلنے لگا اس نے خیال کیا کہ شاید سانس کی آواز سے کمرے کے اندر سوئی ہوئی تمام آنکھیں ابھی کھل جائیں گی، اس نے سانس روکنے کی کوشش کی ـــــ "نینا! ـــــ" اُس کا دم باہر کو نکلا لیکن آواز گلے کے اندر چلی گئی۔ ـــــ لمحہ بھر ٹھیر کے وہ اُس کے قریب چلا گیا۔ ذرا سا جھکا: "اگر میں تمہیں بیہوش کردوں، سوئی ہوئی کو اٹھالوں، بھاگ جاؤں، تمہیں اٹھا کے کہیں لے جاؤں......" اس کا جسم کانپنے لگا۔ اور اگر کمرے میں کوئی جاگتا ہوتا تو وہ دیکھتا کہ اُس کا چہرہ کس طرح سرخ ہو رہا تھا۔ سانس تیز سے تیز تر ہوتا جا رہا تھا، آنکھیں چوڑی چوڑی اور کسی حد تک وحشی ہوتی جا رہی تھیں۔

کنپٹیوں میں دونوں طرف کی رگیں اس کے سانس کی طرح تیزی کے ساتھ اُبھر کر تھرک رہی تھیں۔ پھر اُس نے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ اُس کی آنکھیں ہمیشہ کھلی رہتی تھیں۔ لیکن نینا، اُن کھلی آنکھوں کے سامنے نہیں ہُوا کرتی تھی، اس وقت نینا اسکی آنکھوں کے سامنے سو رہی تھی۔ اور اُس کی اپنی آنکھیں بند تھیں "وہ کسی دوسرے سے محبت کرتی ہے۔ اُس نے بیاہ کر لیا ہے۔ وہ اُسی کمرے میں ساتھ والے پلنگ پر سو رہا ہے۔ نینا اُسی کی ہے۔ تمامتر اُسی کی ہے تم کون ہو؟" اُسے اپنے دل کے اندر سے ایک آواز سی سنائی دی۔ پھر اُس نے آنکھیں کھول لیں۔ ساتھ والے پلنگ کی طرف دیکھا، اُس پر کوئی اسی طرح سویا ہُوا تھا جس طرح پہلے اُس نے دیکھا تھا۔ اُس نے آنکھیں پھر نینا کی طرف موڑ لیں "تم اس سے محبت کرتی ہو اسی لئے اسی کی ہو۔ میں تم سے محبت کرتا ہوں، اس لئے تمہارا ہوں" اس کی آنکھوں سے یہ الفاظ نکل کر نینا کی بند پلکوں پر گرے لیکن وہ شاید اتنے ہلکے تھے، کہ نینا کی پلکوں کو اُن کا ذرا بھی بوجھ محسوس نہ ہُوا۔ اور وہ اُسی طرح بےحرکت اور بند رہیں "نینا میں جا رہا ہوں۔ بہت دور بہت ہی دُور —— جہاں بموں کی آوازوں میں، ہوائی جہازوں کے شور میں، اور زخمیوں کی چیخوں میں، میں تمہیں بھول سکوں نہیں نینا!......" وہ تھوڑا سا اور جھکا۔ اور پہلے کی طرح بن بولے ہی کہنے لگا "بس پہلی مرتبہ

— اور آخری مرتبہ......" وہ نینا کے سوئے ہوئے ہونٹوں پر جھکا "اگر نینا جاگتی ہو تو تمہیں ہرگز اجازت نہ دے" اسے یوں محسوس ہُوا گویا نینا کے بند ہونٹ یہ کہہ رہے تھے۔ اُس نے اپنا سر اوپر کی طرف اٹھا لیا۔ جس طرح کوئی شخص سمندر میں سفر کرتا ہو ابھی سمندر کے اتھاہ پانیوں کی موجودگی میں پیاسا مرتا ہو۔ میلوں چوڑے اور میلوں گہرے سمندر کا پانی اُس کے سامنے ہوتے ہوئے بھی اس کے لئے نہیں ہوتا۔ اسے محسوس ہُوا —— نینا سمندر کے وسیع پانی کی طرح اسکے سامنے تھی۔ لیکن وہ پیاس سے مرتا ہُوا بھی اس سمندر کے پانی کی ایک بُوند بھی اپنے ہونٹوں سے نہیں لگا سکتا تھا۔ اس نے شدت درد سے اپنے سر کو جنبش دی "گناہ ہے تو گناہ ہی سہی" وہ پھر نینا پر جھکا "تم خود گناہ کر سکتے ہو لیکن نینا کو گنہگار نہیں بنا سکتے" اُسکے اندر کوئی کہہ رہا تھا۔ "اگر نینا جاگتی ہوتی" نینا کے بند ہونٹ اُسے کہتے معلوم ہوئے "وہ تمہیں کبھی اجازت نہ دیتی" اُس نے سرد آہ کھینچ کر سر اوپر اٹھا لیا۔ نینا بجلی کی اُس روشنی کی مانند تھی جس کے گرد شیشے کا غلاف چڑھا ہو، اور جل مرنے کیلئے اُڑ اُڑ کر آنیوالا پروانہ بتی کو چھونے کی بجائے شیشے سے ٹکرا کر پرے گر پڑے۔ اُس کے دل میں ایک درد اُٹھا "یہ اُسے محبت کرتی ہے" اُس نے دوسرے پلنگ کی جانب نگاہ کی "اسکے ہونٹوں کو چھو سکتی ہے" اس نے پھر نینا کی طرف دیکھا "لیکن میں اُسے محبت کرتا ہوں" اُس نے اپنے اوپر نگاہ ڈالی

"پھر میں اسکے ہونٹوں کو کیوں چھو نہیں سکتا؟" پھر اُس کا جی چاہا کہ وہ تمام ہچکچاہٹیں چھوڑ دے اور نینا کے ہونٹوں کو چھو لے۔ اگر بعد میں پچھتانا پڑیگا تو خیر وہ پچھتائے گا لیکن اُس پچھتانے کے اندر بھی "کچھ" ہوگا۔ اور اگر اب بھی اُس نے نینا کے ہونٹوں کو نہ چھُوا تو پھر جو پریشانی ہوگی اُسکے اندر اور "کچھ" نہیں ہوگا سوائے پشیمانی کے۔ "نینا اسکے ہونٹوں کو چھو سکتی ہے کیونکہ وہ بھی اُسے محبت کرتا ہے لیکن تم نینا کے ہونٹوں کو نہیں چھو سکتے کیونکہ وہ تمہیں محبت نہیں کرتی۔" اس نے اپنے آپ سے کہا۔ پھر بجلی کی سی تیزی سے اُسے کوئی خیال آیا وہ نینا کے پلنگ سے ہٹ کر اسکے خاوند کے پلنگ کے پاس چلا گیا۔ سوئے ہوئے آدمی کے سوئے ہوئے ہونٹوں پر جھکا۔ یک دم اسے خیال آیا۔ "اگر وہ جاگ اٹھا تو؟" "تو میں زندگی کی شکست اُس کے سامنے رکھ دوں گا۔ جسے نینا محبت کر سکتی ہے وہ شخص اتنا انجان نہیں ہو سکتا کہ مجھے سمجھ نہ سکے۔" اُس نے اُس کے ہونٹوں سے اپنے ہونٹ مس کئے۔ اُسے ایک جھرجھری سی آئی۔ "تمہارے ہونٹوں سے میں نے نینا کے ہونٹوں کی لمس حاصل کر لی ہے۔" اس کے ہونٹوں نے آہستہ سے کہا۔ پھر اُس نے گھوم کر نینا کی طرف دیکھا۔ "جب تم صبح نیند سے بیدار ہوکے اپنے شوہر کے ہونٹوں سے مس کرو گی۔ اُن ہونٹوں پر میرے ہونٹوں کی لمس سوئی پڑی ہوگی۔"

وہ مُسکرایا۔ چھوٹے سے سبز بلب کی دھیمی سی روشنی اُسی طرح پُرسکون تھی۔ وہ کمرے سے نکل کر باغ میں۔ باغ سے دیوار کے پار سڑک پر آگیا ـــــــ رات اُسی طرح تیرہ و تار تھی۔

لوہے کا کھیل

میں لاہور سے واپس کیوں آرہی ہوں؟ اتنی جلدی...... جبکہ سب کو معلوم تھا کہ میں وہاں کم از کم پندرہ دن ضرور رہوں گی...... کسی دوسرے کے ہاں کوئی کتنے دن رہ سکتا ہے؟ وہ میری سہیلی تھی — دن رات باتیں تھیں، ہر شام چائے تھی، سنیما تھا، کھیل تھے۔ لیکن آخر انسان کتنے دن...... بچپن کی سہیلی۔ جس سے جب بھی ملاقات ہوتی رات رات بھر کمبلوں کے اندر منہ کرکے کھسر پھسر کرتے رہنا...... اب بھی تو وہی سہیلی تھی...... تاہم عمر کا بھی تو کچھ تقاضا ہوتا ہے۔ آٹھ دس سال کی عمر اور اب پورے بیس سال...... لیکن اس عمر میں تو محض ٹوٹلی ہنسی ہی نہیں ہوتی۔ نبض تیز تیز تھرکتی ہے...... سانس تیز تیز آتا

ہے...... خون تیز تیز حرکت کرتا ہے...... لیکن اس مرتبہ بھی تو بہت سی باتیں کی ہیں...... اِدھر کی باتیں، اُدھر کے قصے اور...... اور پھر اُس کے......" رتنا سوچتی سوچتی کچھ گھبرا سی گئی۔

"اُس کے بھائی کا دوست — اور کیلاش اُسے محبت کرتی ہے؟" لیکن یہ سوچتے ہوئے اُسے یوں محسوس ہوا گویا وہ اس بات کے متعلق سوچنا نہیں چاہتی۔ "لیکن کیوں؟ وہ ہے تو اچھا...... اُسکے ہونٹوں پر کتنی پرکشش مسکراہٹ......" رتنا نے اپنے سارے جسم کو زور سے جھٹک دیا۔ گویا اس خیال سے کہ اُسکے جسم پر کوئی بوجھ آپڑا ہے۔ اور وہ اسے جھاڑ پھینکنا چاہتی ہے۔

"اُس کے چہرے کی طرف دیکھنے کی ہمت بھی نہیں ہوتی اور اُسکی نگاہ کا خیال بھی تو...... ہاں ہاں! اُس کے لئے ٹھیک تو ہے...... اس سے اچھا اور کیا...... لیکن وہ تو بہت ہی اچھا ہے......" پانی کا رُخ الٹی طرف ہو گیا۔ "لیکن وہ تو بہت ہی اچھا ہے...... اور کیلاش؟......"

پھر رتنا کو محسوس ہوا کہ اپنی سہیلی کے متعلق اُسے یوں نہیں سوچنا چاہیئے۔ اس کی تو یہ خواہش ہونی چاہیئے کہ سہیلی کو اچھے سے اچھا لڑکا ملے۔ نہ کہ اُس لڑکے کو اچھی سے اچھی لڑکی...... کیا وہ اپنی سہیلی سے بھی زیادہ اُسے عزیز ہے؟ کیا وہ کیلاش کی نسبت اس کے زیادہ

قریب ہے؛

ریتا نے اپنی بانہہ کھڑکی میں رکھ دی اور سر بانہہ کے اوپر ٹکا دیا ..... گاڑی چلتی رہی، اپنی پوری رفتار سے چلتی رہی..... درخت، کھیتر گڑھے، ٹیلے، بجلی کے کھمبے، غرضکہ سب کچھ پیچھے رہتا گیا..... انسان اصلیت کو تو پیچھے چھوڑ سکتا ہے، لیکن اصلیت کے جو سایے ہوتے ہیں.... سایے.... تیز تیز بھاگنے پر بھی تو ساتھ ہی بھاگے چلے آتے ہیں۔

"رات کو جب ہم اکٹھی سوتی تھیں تو کیلاش اس کی باتیں کرتے کرتے مجھے بھینچنے لگتی تھی، میں اسکے جسم کی حرارت کیوجہ سے ذرا پیچھے ہٹنے کی کوشش کرتی تھی، تو وہ مجھ سے پوچھتی تھی.... بتاؤ تو بھلا وہ بھی مجھے پیار کرتا ہے یا نہیں؟ میں کیا بتاتی.... ہاں اسے کرنا چاہئے ضرور پیار کرنا چاہئے کیلاش سے..... وہ بہت اچھی لڑکی ہے۔

.... لیکن پرسوں رات کیلاش نے مجھے یہ کیوں پوچھا: ریتا تمہیں کیا ہو گیا ہے؟ لاہور اچھا نہیں لگا تمہیں، تم کچھ کھوئی کھوئی سی کیوں رہتی ہو؟ تمہارا دل اتنا زور زور سے کیوں دھڑک رہا ہے؟ اس نے مجھے بھینچ کر اپنی آغوش میں لے لیا..... کیا سچ مچ مجھے کچھ ہو گیا ہے؟ مجھے بھلا کیا ہو سکتا ہے؟ جب کیلاش اس کی باتیں....

ہاں ہاں اس کی باتیں کرتی ہے تو میرا دل..... لیکن یہ میرا دل تو اس طرح دھڑکتا ہے جس طرح ناول کا مطالعہ کرتے کرتے کسی شیریں سی بات پر سب کے دل دھڑکنے لگتے ہیں... پل بھر کے لئے" ریتا نے پچھلے خیال کو اپنے دماغ میں پھر دہرایا، جیسے کہ یہ خیال اپنی جگہ کو مضبوطی کیساتھ تھامے، اور یہ خیال کم از کم اتنا سا سہارا بن جائے جس پر اس کا ڈگمگاتا ہوا پاؤں اپنا کچھ بوجھ ڈال سکے۔

"اسی طرح کسی کی بات سن کر اپنے دل میں بھی تو دھیرے دھیرے کچھ ہونے لگتا ہے.... کئی مرتبہ.... اچھی سی کہانی پڑھتے ہوئے کہانی کے کردار کی جگہ ہم اپنے آپ کو محسوس کرنے لگتے ہیں.... ہمارا سانس اسی طرح تیز چلنے لگتا ہے۔ اسی طرح گرم گرم ہوتا جاتا ہے.... بس اسی طرح ہی تو ہوتا تھا..... کہ کیلاش جب اس کے بارے میں باتیں کرتی تھی..... کتنی پاگل ہے کیلاش بھی.... بھلا اس نے مجھے یہ کیوں پوچھا: تمہارا دل اتنا زور زور سے کیوں دھڑک رہا ہے؟ وہ بھلا کیا سوچتی ہو گی؟

ریتا کی پیشانی پر ہلکا سا بل پڑ گیا اور اسکے ہونٹ کچھ سکڑ سے گئے۔

"اگر آج میں لاہور ہی میں ہوتی.... اس وقت ہم فلم دیکھنے گئے ہوتے... فلم تو جتنے دن وہاں رہی ہوں قریباً ہر روز ہی تو دیکھنے

رہے ہیں۔ بھائی صاحب ہر روز صلاح بنا لیتے تھے بھائی صاحب کے ساتھ ہیں، میرے ساتھ وہ اور اس کے ساتھ کیلاش، اس ترتیب سے بیٹھا کرتے تھے......

"اس قدر مسکرا کے نہ دیکھو   تمنا کہیں جواں نہ ہو جائے"

اس دن جب یہ ریکارڈ لگ رہا تھا، اس نے میری طرف کس طرح دیکھا تھا"..... اور ریتا نے سب کچھ سوچنا چھوڑ دیا، جیسے شاید اُس نگاہ کے خیال نے دماغ میں سوچنے کے لئے کوئی جگہ باقی نہ رہنے دی ہو۔

ریتا کو جھرجھری سی محسوس ہوئی: اور اُس نے میری طرف اس طرح کیوں دیکھا؛ جیسے ہلکا ہلکا سا نشہ ہو رہا ہو، جیسے سرور آتا ہو، جیسے نیند آنے لگتی ہو..... ریتا اپنے آپ میں گم ہو گئی..... ایسی گم سم جس میں نہ درد محسوس ہوتا ہے، اور نہ کسی لطف کا احساس ہوتا ہے۔ ہونٹوں سے خواہ زہر کا پیالہ لگا دیا جائے، خواہ امرت کا تمیز نہیں رہتی۔ اور آنکھوں کو جیسے کسی جادوگر نے بینائی ہوتے ہوئے بھی بے نور کر کے رکھ دیا ہو، آنکھوں کو، سانس کو اور شاید سوچ کو بھی کسی سحر کے زیر اثر بے حس کر کے رکھ دیا ہو۔

سٹیشن آ گیا ہلکا سا دھچکا لگا۔ ریتا سنبھل کے بیٹھ گئی: "اُسے

میری طرف یوں گھورنا نہیں چاہئے تھا۔ اگر کیلاش نے دیکھا ہوتا وہ کیا خیال کرتی؛ اترسوں دریا کے اُس پار نالہ پھاندتے وقت اس نے میرا ہاتھ پکڑا تھا۔ اور پار ہو کر جب میں ہاتھ چھڑانے لگی۔ تو اس نے آہستہ سے کہا تھا" رہنے دو اسی طرح" ریتا کی پیشانی میں درد ہونے لگا، گویا اتنی بڑی بات اس کے دماغ میں سما نہ رہی تھی۔ اس نے ایک ہاتھ سے اپنا ماتھا دبانا شروع کیا اور دوسرا ہاتھ کھڑکی کے باہر ڈھیلا چھوڑ دیا، جیسے اب بھی وہ اس کے ہاتھ میں تھما تھا "رہنے دو اسی طرح" ریتا نے اپنے ہونٹوں میں دہرایا، شاید اس لئے کہ اُس کی آواز کی کوئی جھلک وہ اپنے الفاظ میں دیکھنے کی متمنی تھی۔

"بیچاری کیلاش...... مجھے یوں نہیں سوچنا چاہئے" ریتا نے اپنے بازو سے سر اٹھا لیا اور دوسرا ہاتھ بھی اندر کھینچ لیا۔ گویا ایسا کرنے سے وہ اس قسم کے خیالات اپنے دماغ سے نکالنے میں کامیاب ہو سکے گی۔

"ذرا سا سوچ لینے میں بھلا کیا بگڑتا ہے؛ سچ سچ تو کچھ ہونے سے رہا" ریتا نے پھر اپنا بازو کھڑکی پر اور سر بازو پر رکھ کے سوچنا شروع کیا: "رہنے دو اسی طرح" ریتا کے ڈھیلے پڑے ہوئے ہاتھ نے

کھڑکی کے سرے کو اسی طرح تھوڑا سا دبا دیا، جس طرح اس دن اس نے رینا کا ہاتھ دبایا تھا۔ آنکھیں بند تھیں لیکن رینا کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔ اُسے یاد آیا کہ پھر اُس نے رینا کا ہاتھ چھوڑتے ہوئے آہستہ سے ایک سرد آہ بھری تھی۔

"نہیں نہیں، یہ سب کچھ مجھے یوں کیوں محسوس ہوتا ہے؟ بھلا مجھ سے اگر نالہ پھلانگا نہ جا سکا، اور اس نے میرا ہاتھ تھام کے مجھے پار کر دیا تو اس میں کون بڑی بات ہوئی۔" "رہنے دو اسی طرح" بھی کہہ دیا تو کیا ہوا۔ سرد آہ کہاں بھری تھی، اس نے یونہی سانس لیا ہوگا۔ یہ بھی بھلا کوئی سوچنے کی بات ہے؟ میں بھی پاگل ہوں ..... اچھا اگر یہ بات نہ بھی ہو تو اس طرح سوچنے سے میرے دل میں یہ ہل چل .... اور اگر سوچ بھی لوں تو .... نہیں نہیں —— وہ کیلاش سے محبت کرتا ہے .... اگر نہیں بھی کرتا تو اُسے کرنی چاہئے ..... وہ بیچاری ... ... کیا میں اسی لئے لاہور سے اتنی جلدی واپس ..... اس کی باتوں سے اب میں کچھ گھبرانے لگی تھی، وہ جب بھی سامنے آتا تھا ....." رینا سنبھلی گھر بھی تو آخر جانا ہی تھا ... آٹھ نو دن رہ لیا تھا .... میں گھبرائی کب تھی؟ رینا تن کر سیدھی ہو بیٹھی۔ گویا وہ اپنی گھبراہٹ کی نسبت خود زیادہ طاقتور ہے۔

پرسوں فلم میں .... تاریکی میں اپنے دائیں جانب سے مجھے یوں محسوس ہوتا تھا کہ اُسکی گردن بار بار میری طرف مُڑتی ہے۔ اور میں نے ادھر دیکھنا ہی تھا، یہ معلوم کرنے کیلئے کہ وہ مُڑ مُڑ کر میری طرف کیوں دیکھتا ہے .... اور اُسکی سیاہ چمکدار آنکھیں مجھ پہ ٹکی ہوئی تھیں ..... لیکن وہ اس طرح کیوں تاکتا تھا؟ اسے کیا حق تھا یوں تاکنے کا؟" رینا کے چہرے پر پشیمانی کے آثار تھے —— لیکن ساتھ ہی شاید غصے کے بھی۔

"میں اسکے متعلق نہیں سوچونگی .... نہیں سوچونگی۔" رینا نے اپنا ہونٹ دانتوں میں بھینچا اور سر کو زور سے جنبش دیتے ہوئے کمرے کی دوسری سواری کی طرف نگاہ کی۔ سیکنڈ کلاس کا ڈبہ تھا، ایک ہی سواری اور تھی، اور وہ اخبار پڑھنے میں مشغول تھی۔ رینا کو یوں محسوس ہوا کہ اُسکے دماغ کی پختہ دیوار میں بھی کوئی درز تھی۔ اور وہ خلا خلا ہوتے ہوتے بھی خلا تھا، جسکے جوڑ میں وہ لوہے کے کیل کیطرح گڑتا جا رہا تھا .... گڑ گیا اور شاید اس حد تک جہاں تک گڑ کے وہ پھر ہاتھ سے باہر کھینچا نہ جا سکتا ہو .... لوہے کا کیل۔

امرتسر آگیا، سواری اُتر گئی، گاڑی پھر چل دی۔ خالی خالی جگہ میں گاڑی کا شور گویا اس چوٹ کا کام دے رہا تھا جس سے کیل اور بھی گہرا اندر اترتا جاتا ہو۔

"کتنی شرم کی بات ہے کہ میں اسکے متعلق سوچنا نہیں چھوڑ سکتی۔" رینا نے اٹیچی کیس کھولا اور پڑھنے کیلئے ایک کتاب نکال لی ... "شاید لوگ سینما بھی اسی لئے دیکھتے ہیں۔ کتاب بھی اسی لئے پڑھتے ہیں، دوسرں

کے ساتھ باتیں بھی اسی لئے کرتے ہیں..... کہ وہ کسی کے متعلق سوچنا چھوڑ سکیں..... سوچنا..... لیکن وہ چیزیں جن کے متعلق سوچنا ہم چھوڑ دیتے ہیں..... رات کو سوتے میں ہماری سوچ پر چھا جاتی ہیں، ..... رات کو..... تاریکی میں..... سپنوں میں..... سپنے..... جو کچھ تو عالمِ خواب میں آتے ہیں، اور کچھ عالمِ بیداری میں، چلتے پھرتے، باتیں کرتے، کتاب پڑھتے..... میں بھی تو ایک کتاب پڑھ رہی ہوں؟ رینا کو ہنسی آگئی، عین اُسی طرح جس طرح کوئی اپنے اعترافِ شکست پر ہنسنے لگتا ہے۔

اصل بات تو یہ ہے کہ ہمارے دل کی عادت ہے کہ جدھر سے اسے روکیں، منع کریں، یہ ادھر ہی رُخ کرتا ہے۔ بلکہ اور بھی زیادہ زور کے ساتھ اُدھر ہی بھاگتا ہے۔ اور دل کو درمیانی حالت میں رکھنے کا طریقہ یہ ہے کہ اسے کسی بھی طرف سے اس حد تک روکا نہ جائے..... تو کیا پھر میں تھوڑی دیر کیلئے اس کے متعلق سوچ لوں؛ نہ سوچنے سے دل اور بھی زیادہ اُدھر جائے گا..... اس لئے..... جب سب مجھے رخصت کرنے سٹیشن پر آئے تھے..... وہ بھی..... وہ کتنا خوبصورت ہے ..... اسکے جسم کی بناوٹ..... اسکے چہرے کے خط و خال..... اُس کی آنکھیں..... ہونٹ..... دراصل مسکرانا تو صرف اُسے ہی آتا ہے..... کس خوبصورتی سے مسکراتا ہے۔" رینا بیٹھی بیٹھی خود مسکرانے لگی ——

کتاب نے ٹیڑھی ہو کے انگلیوں کو حرکت دینی چاہی — انگلیاں اُسی طرح بے حرکت رہیں..... کتاب نے انگلیوں میں سے پھسل کر اُسکے خیال کو ٹھونکا دینا چاہا، خیال اُسی طرح محوِ خواب رہا۔ اور کتاب بیچاری سیٹ سے نیچے گری، چپ چاپ پڑی رہی۔

سٹیشن آگیا..... جالندھر، رینا کا شہر..... جس طرح خواب آنکھیں کھولتے ہیں..... رینا نے جھانکا، پلیٹ فارم، قلی، مسافر، شور.....

اور گاڑی کے دروازے میں وہ.....

رینا نے آنکھیں جھپکیں..... خواب ٹوٹ نہیں رہا تھا۔ وہ کمرے کے اندر آگیا۔

"رینا!" وہ رینا کے قریب آگیا

رینا نے پھر آنکھیں جھپکیں۔

"رینا! میں گاڑی کے روانہ ہو جانے کے بعد ٹیکسی پر آیا ہوں۔ اور گاڑی پہنچنے سے پہلے یہاں پہنچ گیا ہوں۔"

حقیقت بعض اوقات تخیل سے بھی زیادہ رومانٹک ہوتی ہے۔ رینا کے کانوں کو یقین نہ آیا کہ وہ بول رہا تھا۔

"رینا! مجھے کچھ کہنا ہے۔"

رینا کے ہوش اُڑ رہے تھے۔

"خدا کا واسطہ دیتا ہوں ریتا! بولو تو سہی۔ کوئی آجائیگا۔ میں تمہارا فیصلہ سُننا چاہتا ہوں" اس نے ریتا کے ہاتھ پکڑ لئے۔ ریتا نے آنکھیں بند کر لیں۔ شاید اس لئے کہ جو کچھ ہو رہا ہے۔ اسی طرح ہوتا ہے، اور اسکے علاوہ اور کچھ دکھائی نہ دے یا شاید اس لئے کہ یہ سب کچھ نہ ہو اور اُسے نظر نہ آئے۔

"ریتا! میری محبت تمہاری نذر ہے۔"

ریتا کانپنے لگی "تو پھر لوٹ جائیے ...... یہی الفاظ کیلاش کی نذر کیجئے۔"

"ریتا! ......" اس کی آواز میں عاجزی تھی۔

"ابھی ...... اسی وقت۔" ریتا کے الفاظ میں حکم کا سا لہجہ تھا۔

ریتا گاڑی سے اُتری، پھاٹک میں سے گذری، تانگے میں بیٹھی ...... گھر آ گئی۔

کمرے کی کھڑکی میں بازو اور بازو پر سر رکھ کے وہ کچھ سوچنے لگی، لیکن اس سوچ میں نہ گھبراہٹ تھی ...... نہ بےچینی ...... اور نہ پشیمانی تھی، لیکن کچھ اس طرح تھا ...... جس طرح لوہے کے کیل کو اوزار اگر باہر کھینچ بھی لیں تو وہ دیوار کا پلستر بھی ساتھ ہی اکھاڑ لاتا ہے۔ اور ایک گہرا سیاہ داغ اپنی جگہ چھوڑ جاتا ہے — لوہے ...... کا ...... کیل۔

چھوٹی کہانی

وہ کہانیاں لکھا کرتا تھا۔ چھوٹی چھوٹی کہانیاں۔ مختصر افسانے۔ نہ معلوم اُس نے کتنے افسانے لکھے اور ان میں کیا کیا لکھا۔ لیکن اُس نے ایک کہانی لکھی، نہایت مختصر —— اتنی مختصر کہ گھڑی کی بڑی سوئی جب تین پر تھی تو ابھی اُس نے لکھنا شروع بھی نہیں کیا تھا۔ اور جب وہی سوئی چار پر پہنچی تو وہ کہانی مکمل ہو چکی تھی —— اُس نے تو اتنی چھوٹی اور مختصر کہانی لکھی لیکن "ریشما" کو نہ معلوم کیا ہوا۔ وہ یہ محسوس کر رہی تھی، اگر اپنی تمام عمر وہ اُس کہانی کا مطالعہ کرتی رہے تو بھی شاید ختم ہونے میں نہیں آئے گی ...... وہ کہانی — چھوٹی کہانی۔

ریشماکو یوں محسوس ہوا جیسے اُس کی زندگی ایک خالی ورق تھا جس پر اُس مختصر فسانہ نگار نے ایک ایسا افسانہ لکھا جس کے ایک ایک لفظ کو وہ کئی کئی مرتبہ پڑھ چکی تھی۔ پھر بھی وہ فسانہ ختم نہ ہوتا تھا — وہ مختصر افسانہ۔

وہ کہانی لکھی بھی تو اُن ہی معدودے چند الفاظ میں گئی تھی۔ جن میں اُس سے پہلے سینکڑوں کہانیاں لکھی جا چکی تھیں —۔ البتہ کاغذ کا فرق ضرور تھا — دوسری کہانیاں شاید فُلسکیپ سائز کے ہلکے سے کاغذ پر سپردِ قلم کی گئی تھیں۔ اور اعلےٰ درجے کے آرٹ پیپر پر چھپی تھیں —— لیکن وہ کہانی ریشما کے صفحۂ زندگی پر لکھی گئی۔ اور اُس کے پان کے پتے ایسے دل پر نقش ہو گئی۔ جو اُس نے گھڑی کی بڑی سوئی جب تین پر تھی یوں لکھنا شروع کی تھی:

"بس جا رہی ہیں آپ؟"

"جی ہاں۔"

"مجھے آپ سے کچھ کہنا ہے۔"

"کیا کہنا ہے؟ کہئے۔" ریشما کرسی پر پھر بیٹھ گئی — لیکن اس سے آگے وہ کچھ نہ بولا۔ اور ہاتھ میں پکڑی ہوئی سرخ پنسل سے سامنے رکھے بلاٹنگ پیڈ پر چھوٹی چھوٹی لکیریں کھینچنے لگا۔ ریشما اتنی دیر سے اس کی

طرف دیکھا کی۔

"لیکن اگر میرا کہا آپ کو بُرا لگے تو آپ ناراض تو نہ ہو جاؤ گی؟"

"لیکن آپ کا کہا بُرا ہو گا ہی کیوں؟"

"ہو سکتا ہے۔"

"نہیں۔"

"رفاقت تو اسی طرح قائم رکھیں گی؟"

"ضرور۔"

وہ پھر بلاٹنگ پیڈ پر سُرخ پنسل سے چھوٹی چھوٹی لکیریں کھینچنے لگا۔

"بتائیے نا۔" ریشما نے خود ہی پوچھا۔

اُس نے پیڈ سے سر اٹھا کر ریشما کی طرف دیکھا۔ لیکن منہ سے کچھ نہ کہا۔

"پھر نہیں بتائیں گے؟" ریشما نے دوبارہ دریافت کیا۔

"بتاؤں گا — لیکن بتانے سے پہلے ایک سوال کا جواب چاہتا ہوں۔"

"کیا؟"

"نہایت چھوٹا سا سوال ہے۔"

"لیکن ہے کیا؟"

اب تیسری مرتبہ وہ پھر بلاٹنگ پیڈ پر جھک گیا۔ اور اُسی لال پنسل سے چھوٹے چھوٹے خط بنانے لگا — اب ریشما خاموش تھی۔

"آپ محبت کو گناہ سمجھتی ہیں؟" اس نے پیڑ سے یک لخت سر اٹھا کر پوچھا

"محبت بذاتِ خود کوئی گناہ نہیں۔" دِشتما نے ذرا رُک کر جواب دیا۔

"بذاتِ خود سے کیا مراد ہے؟"

"کوئی غرض یا آرزو جب محبت میں شامل ہو جائے تو وہ گناہ بن جاتی ہے۔"

"نہیں نہیں بالکل بے لوث، صادق اور بے غرض محبت۔"

"تو پھر وہ گناہ نہیں۔"

"اگر آپ اسے گناہ نہیں سمجھتیں تو میں گناہ نہیں کر رہا۔"

گھڑی کی بڑی سوئی تین سے چل کر بمشکل چار پر پہنچی تھی۔

کنسو

کنسو اور گرگٹ دو مختلف چیزوں کے نام ہیں۔ کنسو ایک عورت ہے گرگٹ ایک پرندہ، لیکن جس شخص نے کنسو اور گرگٹ دونوں کو دیکھا ہو اُسے دونوں کی شکل صورت میں تو فرق نظر آئے گا، لیکن دونوں کی عادات سے متعلق ضرور مغالطہ ہونے لگے گا۔

صبح کے ساڑھے چار بجے کا وقت ہے، اور اگر آپ کا مکان واٹر ورکس کے تالاب سے ہو کر راوی دریا کی طرف جانے والی سڑک کے کہیں قریب ہے تو آپ چاہے سردیوں میں دروازے اور کھڑکیاں بند کر کے کمرے کے اندر سوئے ہوئے ہوں اور گرمیوں میں اپنے مکان کی آخری چھت پر مستِ خواب ہوں، آپ کے کانوں میں ایک آواز

آئے گی:-

جے شیو شنبھو شرن تمہاری

نسوانی گلے کی آواز، باریک اور سُریلی، لیکن مردانہ گلے کی طرح بھرپُور اور زوردار ـــــ اور اگر کبھی علی الصبح منہ اندھیرے آپ بھی دریا پر جانے کی ہمت کریں۔ تو آپ دیکھیں گے ایک بوٹا سا قد جس کی چھوٹی چھوٹی ٹانگوں کے ڈگ بہت تیز ہوں، ایک بھاری بھر کم جسم جو کسی شوخ ادا دوشیزہ کی طرح ہر ہر گام پر رقص کناں ہو، ذرا چھوٹی چھوٹی گلاب کی کلیوں ایسی گول لیکن نہایت چمکدار آنکھیں، ترچھی نگاہ اور نیکھی چتون، سرخ، سفید اور سیاہ سہ رنگے بالوں والا سر جو تیز چال اور گیت کی لے کے ساتھ ساتھ کبھی اِدھر اور کبھی اُدھر جُھکتا ہے۔ دنداسے کے کثرت استعمال سے جامن کا سا سیاہ رنگ لئے ہوئے ہونٹ جو اس گیت کے بول پر ستار کی تاروں کی طرح تھرکتے ہوتے ہیں۔ اور نیلے سے ناخنوں والے پور (سستا سا خضاب لگانے سے ناخنوں کا رنگ نیلگوں ہو جاتا ہے) سفید مالا کے منکوں پر نیلے کبوتروں کی طرح دانہ چُگ رہے ہوتے ہیں۔

اگر آپ بہت ہی تڑکے جائیں تو کنسو آپ کو دریا کی سمت جاتی ملے گی۔ اور اگر آپ کو ذرا دیر ہو گئی تو پھر وہ دریا سے واپس لوٹتی ملے گی۔

اور اگر جاتے جاتے آپ کے دائیں بائیں یا پُشت کی طرف سے "جے سیتا رام" کی آواز سُنائی دے اور اُس کے ساتھ ہی جواب میں "جے سیتا رام" کی مردانہ آواز بھی آئے اور آپ مُڑ کر دیکھیں تو کنسو ـــــ بڑھاپے کی سفیدی کو خضاب کے سیاہ رنگ میں ڈھالنے والے کسی لالہ کے پاس کھڑی نظر آئے گی۔ اور اگر ذرا کان دھر کر سُنیں تو:-

"شاہ جی! کہئے چھوٹے لالہ کی بیوی اچھی ہے نا؟ اچھا شکر ہے گھر کا دروازہ تو کُھل گیا...... شاہنی کی عدم موجودگی..... افسوس..... یہ سُن کر شاہ جی کے منہ سے بھی ایک سرد آہ نکل جائے گی۔

پھر آواز آئے گی:-

"گھروں کا بھلا کوئی حال رہتا ہے...... سب کچھ ہوتے ہوئے بھی گھر سُونا سُونا دکھائی دیتا ہے۔ لاکھ نوکر چاکر ہوں، برکت نہیں ہوتی۔" یہ سُن کر شاہ کا پیلا زرد چہرہ نہایت قابلِ رحم ہو جائے گا۔ "اچھا شاہ جی! اگر گھر میں روٹی وغیرہ کی کوئی تکلیف ہو۔ تو ایک غریب بیوہ ہے۔ بے چاری پیسے پیسے کو محتاج ہے۔ اگر آپ کا کوئی کام ہو تو وہ غریب...... کیا کرے بے چاری دو جوان لڑکیاں ہیں اس کی۔ قابلِ شادی، حُسن اور بھرپُور جوانی.... اچھا جے سیتا رام"

کنسو پھر آگے بڑھ جاتی ہے۔ وہی تیز چال۔ اور وہی سفید مالا

کے منکوں پر بنیاگوں پور ــــ اور اگر آپ گھوم کر شاہ جی کی طرف پھر دیکھیں تو ان کی چال پہلے سے بھی مدھم ہو چکی ہوگی اور قدم بھاری۔

کبھی کبھی راہ چلتی کنسو کسی سے دریافت کرتی ملے گی "شاہ جی! کیا وقت ہے؟ یا۔ شاہ جی! ریزگاری ہوگی ایک روپے کی آپ کے پاس؟ اس کی چھوٹی چھوٹی گول آنکھوں میں نہ معلوم کس قسم کی ہمدردی بھری ہوتی ہے، کہ مخاطب شخص اگر بے چارہ کسی نوع حاجتمند ہو تو اس کے دل کا کوئی نہ کوئی پلو کنسو کے آگے کھل کر پھیل جاتا ہے۔ اور تقریباً اسی طرح ہی ہر نیا آدمی اُس کا واقف بن جاتا ہے

اور کبھی کبھی یوں بھی ہوتا ہے کہ دوپہر کے وقت جب عورتیں گھر کے کام کاج سے فارغ ہوتی ہیں، تو کسی گھر کی مالکہ دیکھتی ہے کہ آج یہ اجنبی سی کون عورت ہے جو ہمارے کوٹھے پر چڑھتی آرہی ہے؟ سفید سرخ اور سیاہ ــــ سہ رنگے بالوں والا سر کرے کی چاروں اطراف کا چھوٹی چھوٹی گول آنکھوں سے جائزہ لیتا ہے۔

"بہن جی! کسے تلاش کرتی ہیں آپ؟" گھر والی حیران ہو کر پوچھتی ہے۔

"میں تو شاید گھر ہی بھول گئی ہوں" وہ بھی حیران ہو کر گھر والی کی

"کس کا گھر تلاش کرتی ہیں آپ؟"

"سیڑھیاں چڑھتے چڑھتے دم پھول گیا ہے۔ کتنی منزلیں ہیں ......" اور کنسو ذرا فاصلے پر پڑے مونڈھے کی طرف نگاہ کرتی ہے۔

"ہائے ہائے آپ بہت تھک گئی ہیں۔ ہُوا کیا جو آپ اِدھر آنکلیں۔ بیٹھ جاؤ، ذرا سستا لو۔ یہ بھی آپ ہی کا گھر ہے۔"

اور اس طرح کنسو کی واقف بن جاتی ہے وہ عورت۔

شام کے وقت جب مندر میں کنھا ہوتی ہے۔ تو پنڈت جی کے بائیں طرف، دو چھوٹی چھوٹی گول آنکھیں...... نیم وا اور نیم بند... جامن سے سیاہ دو ہونٹ، بھجن کے بول پر ستار کی تار کے ساتھ ساتھ تھرکنے والی طرلوں کی طرح متحرک ہوتے ہیں۔

"کرشن دیو اور مہادیو کا   ان دونوں کا ایک ورن
کرشن تو اوڑھے شال دوشالے   شنبھو لگاوے تن میں بھسم
کرشن دیو اور......
کرشن تو مکھ سے بنسی بجاوے   شوجی بجاوے ڈور مردنگ
کرشن دیو اور......
کرشن کے سر پہ مکٹ براجے   بھولا کی جٹوں میں واگے گنگ

کرشن دیو اور......

کرشن تو کھاوے مصری ماکھن　　بھولا جی کھاوے سوکھی بھنگ

کرشن دیو اور.....

کرشن تو بن میں دُین چراوے　　بھولا چراوے نندی گن

کرشن دیو اور بھاں دیو کا　　ان دونوں کا ایک وَرن"

——— اور جس وقت کتھا ہو رہی ہو، تو ہونٹوں کی بجائے ہاتھ کی انگلیوں کے نیلے نیلے پور بھجن کے الفاظ پر نہیں، بلکہ سفید مالا کے منکوں پر، دانہ چگ رہے نیلے نیلے کبوتروں کی طرح کھیل رہے ہوتے ہیں۔ شام کے ساڑھے پانچ بجے ——— سفید سرخ اور سیاہ ——— سہ رنگے بالوں والا سر قدرت کے اصول کی طرح ٹھاکروں کے سامنے جھکتا ہے۔ پھر مندر سے واپسی پر اور سب کچھ تو وہی ہوتا ہے۔ لیکن اُس پیشانی کے درمیان میں دونوں ابروؤں سے ذرا اوپر پھیکے سے رنگ کے سندور کا نشان ہوتا ہے، گویا ٹھاکروں نے انگوٹھا لگا کر کسی سودے پر مُہر تصدیق ثبت کردی ہو۔ پھر مندر کے عقب میں ——— وہی صبح والا شاہ جی یا کوئی دوسرا شخص ——— شہنشاہ سلامت کی تصویر والا ایک چھوٹا سا کاغذ، جس کے ایک کونے پر پانچ یا دس کا ہندسہ بھی

لکھا ہوتا ہے۔ کنسو کے نیلے نیلے پوروں والے ہاتھ میں تھماتا ہے۔

"اچھا اچھا ضرور ضرور" اور وہ چھوٹی چھوٹی گول آنکھیں اور بھی چمک اٹھتی ہیں۔ جس سے وہ اور بھی زیادہ گول معلوم ہونے لگتی ہیں ——— اور اگلے دن علی الصباح منہ اندھیرے پھر وہی آواز:۔

"جے شو شنبھو شـــرن تمہاری"

گناہ

ڈلہوزی ڈاکخانے کا چوک ہاتھ کی ہتھیلی کی طرح پھیلا ہوا ہے۔ مچھ ریکھا کی مانند اس پر ایک درخت ہے، جس کی شاخیں عمر اور قسمت کی لکیروں کی طرح ادھر ادھر پھیل رہی ہیں۔ پہلی گرم سڑک، دوسری ٹھنڈی سڑک، تیسری بیلون کی سڑک، چوتھی کریلینو کی اور پانچویں پنج پُلا کی سڑک۔ پانچوں انگلیوں کی طرح اس ڈاکخانے کے ہتھیلی جیسے چوک کے ساتھ وابستہ ہیں۔

ہمارا نوکر ہر صبح پکانے کیلئے جب دال سبزی وغیرہ پوچھتا تو اس وقت جلدی میں کچھ سوجھتا نہ تھا تو میں کہہ دیتی کہ سردار جی سے دریافت کرو۔ اور سردار جی اپنی بلا ٹالنے کی غرض سے کہہ دیتے کہ بی بی جی سے پوچھو۔ آخر ہم نے فیصلہ کیا کہ جس سبزی کے نام کا پہلا حرف اس دن کے نام کے پہلے حرف سے ملتا ہو نوکر وہی سبزی پکا لیا کرے۔ مثلاً اتوار کے دن آلو گوبھی یا آلو گوشت سوموار کو سیویاں یا اسی قسم کی کوئی اور شے، منگل کے دن مونگ یا ماش کی دال وغیرہ۔ لیکن جب کبھی اسکے برعکس ہمیں کوئی اور شے کھانا مطلوب ہوتا تو ہم منگل کو ٹیوزڈے کہہ کر ٹینڈے اور ٹماٹر منگا لیتے۔ اس طرح اپنی خواہش بھی

پوری کر لیتے اور بزعم خود اپنے اصول پر بھی قائم رہتے۔ اسی طرح ہم نے اپنے سیر کے پروگرام کو بھی ہفتے کے دنوں پر تقسیم کر رکھا تھا، تاکہ ہر روز ایک ہی طرف جانے سے طبیعت اُکتا نہ جائے۔ اس دن ہماری باری پنج پُلا جانے کی تھی ---- سیر کرتے کرتے جب ہم تھک گئے تو پنج پُلا کے اس طرف پتھروں پر جا بیٹھے۔ اتنے میں ایک بارہ تیرہ سالہ پہاڑی لڑکی اپنی گائیں چراتی ہوئی ہمارے پاس آکھڑی ہوئی۔ اس کے پاس ٹماٹر اور مکی کے بھٹے بھی تھے۔ وہ ہم نے اس سے خرید لیے، اور وہ ہمارے پاس بیٹھ کر باتیں کرنے لگی۔ دوران گفتگو اس نے مجھ سے پوچھا۔

"یہ تمہارا کیا لگتا ہے؟"

"میرا دولھا میاں" میں نے ہنس کر جواب دیا۔

"نہیں" اس نے ہمارا یہ رشتہ منظور کرنے سے صاف انکار کر دیا۔

"ہاں۔ میں اس کا دولھا میاں ہوں" پریتم جی نے ہنس کر کہا۔

"نہیں" اس نے پھر وہی انکار کیا۔

"کیوں" میں نے اس سے پوچھا "یہ میرا دولھا میاں کیوں نہیں؟"

"تم اتنی سی چھوکری اور اسکی اتنی بڑی بڑی مونچھیں۔ یہ تمہارا دولھا میاں نہیں۔"

میں نے اسے سمجھایا کہ سکھوں کی عمر اس سے چھوٹی ہوتی ہے جو انکی شکل و صورت سے ظاہر ہوتی ہے۔ میرا دولھا میاں صرف چار سال مجھ سے بڑا ہے

اور عمر میں اتنی تفاوت بالکل درست اور مناسب ہے۔ اگرچہ وہ لڑکی ابھی کنواری ہی تھی، پھر بھی میں نے اس سے دریافت کیا۔

"تمہارا دل کتنا بڑا دولھا میاں حاصل کرنا چاہتا ہے؟"

"اتنا بڑا..." اس نے اپنے سر سے ذرا اونچا ہاتھ کر کے شرماتے ہوئے جواب دیا۔

گویا اسکے برابر — اس کا مناسب جوڑ..... مجھے پنجابی کا ایک گیت یاد آگیا۔

چھول وچ پانی آں سروں دیاں گندلاں
پچھی وچ پانی آں موٹھ
ماہی میرا نکا جیہا
اوہدے پتلے پتلے ہوٹھ...... ماہی میرا نکا جیہا

اُسے — پورو کو — بھی "نکّے جیے ماہی" (چھوٹے سے محبوب) کا چاؤ تھا۔

اس بات کو ایک سال ہو گیا۔ میں کچھ بیمار ہو گئی۔ اسلئے اگلے موسم گرما کے آغاز ہی میں ہمیں ڈلہوزی آنا پڑا۔ مکی کی فصل ذرا دیر سے پکتی ہے۔ میرا دل نہایت نرم اور تازہ بھٹا کھانے کو چاہا۔ سیر کرتے ہوئے ایک پچھے سے مکان کے سامنے ہم نے مکی کا کھیت دیکھا۔ اس خیال سے کہ کوئی نہ کوئی دانہ تو خوشے میں ہوگا ہی ہم نے اس مکان کا دروازہ آہستہ سے کھٹکھٹایا تاکہ وہ اپنے کھیت سے ہمیں دو چار خوشے اتار دیں۔ دروازہ کھول کر جو لڑکی باہر آئی وہ پورو تھی — پورو... میں نے اُسے پہچان لیا۔ لیکن پورو اب وہ بارہ تیرہ سالہ الھڑ سی دوشیزہ نہیں تھی۔ بڑے سے

گھیرے والے گھگھرے نے گھنگروؤں والی ہاتھ کی چوڑیوں نے، پاؤں کی چاندی کی پازیبوں نے اور گلے کے چاندی کے ہار نے اسے انجان اور بھولی دوشیزہ سے تبدیل کر کے ایک سیانی عورت بنا رکھا تھا۔

"پورو!" میں نے خوشی سے اچھل کر کہا

"جی!" اس نے تھوڑی سی جھجک کیساتھ مسکرا کر کہا۔ شاید اسلئے کہ اب وہ عورت بن چکی تھی۔

"تمہارا بیاہ کب ہوا؟"

"دو ماہ ہوئے ہیں" اور اس نے نگاہیں نیچی کر لیں۔

"اتنا بڑا دولھا میاں" اس کا پچھلے سال کا کہنا مجھے یاد آگیا۔

"کتنا بڑا ہے تمہارا دولھا میاں؟" میں نے پوچھا۔

لیکن اس نے میری طرف آنکھیں نہ اٹھائیں — اتنے میں اس سے ذرا لمبا ایک لڑکا وہاں آیا اور کہنے لگا۔ "اماں! دودھ کی بالٹی کہاں رکھی ہے؟"

"سامنے کھڑکی کے اوپر" پورو نے لڑکے کو جواب دیا... لڑکا چلا گیا۔ پورو کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ مجھے کچھ اور پوچھنا نہ پڑا — اس نوجوان لڑکے کا باپ کتنا بڑا ہوگا؟ یہ بغیر دیکھے اور دریافت کئے ہماری آنکھوں کے سامنے آگیا۔

"اتنا بڑا......" پورو کے سر کے برابر۔ اس کا ہم عمر، اس کا جوڑ.......

پورو کا پچھلے سال کا کہنا مجھے یاد آ رہا تھا۔